S-47

خون

۱/-

اکرم الہ آبادی

جاسوسی دائرہ سیریز

گونج

اکرم الہ آبادی

Akram Allahabadi

فرحت پبلیکیشنز۔ممبئی۔انڈیا

جملہ حقوق بحق پبلشر محفوظ ہیں

اس ناول میں شائع ہونے والے تمام واقعات،
مقامات و کردار فرضی ہیں۔اس سے کسی طرح
کی مطابقت محض اتفاقیہ ہے۔جس کی مصنف،
پبلشر و پرنٹر پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

اس ناول کی دوبارہ اشاعت، ترجمے یا کسی اور مقصد سے استعمال کے
لئے پبلشر کی تحریری اجازت ضروری ہے ورنہ قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔

پرنٹر:۔۔۔۔۔ممبئی۔انڈیا

Akram Allahabadi

انتساب

بڑے خلوص کے ساتھ اپنے محترم دوست حاتم
علی قیومی، جنرل منیجر سیف بینک (لمیٹڈ) کے نام،
جنہیں کتابیں پڑھنے کا کم اور رکھنے کا زیادہ شوق
ہے۔

اکرم

Akram Allahabadi

نئے مہمان

بلدان کی سبز پوش وادی پیچھے رہ گئی تھی اور نیرو گیج ٹرین اب بادلوں کے کہر سے گزرتی، بھیگتی، فراز کی طرف بڑھ رہی تھی۔ دونوں طرف چٹانیں کاٹ کر درمیان سے پٹریاں ڈالی گئی تھیں اور کنارے کنارے سبزے کا فرش تھا۔ انجن کو چڑھائی پر پہنچنے کے لیے اتنا زور لگانا پڑ رہا تھا کہ اس کی رفتار آدمی کی رفتار جتنی رہ گئی تھی۔ کوئی ہوائی جہاز سے دیکھتا تو وہ کسی ڈھیر پر کیچوے کی طرح رینگتی معلوم ہوتی۔ بادل بند کھڑکیوں کے شیشوں سے ٹکرا کر انھیں نم آلود کر دیتے یا کھلی کھڑکیوں سے باہر نکل جاتے، جیسے آنکھ مچولی کھیل رہے ہوں۔ ٹھنڈی بھاپ کے اس دیس میں ہر چیز اپنا قدرتی حسن لیے کھڑی تھی۔ پہاڑ، درخت، چٹانیں، پودے، سبزہ اور ٹیسو کے پھول، جو دور سے ایسے دہکتے، جیسے کہیں آگ لگی ہو۔

پریمانے کھڑکی سے سر نکال کر ایک تازہ سانس لی اور ان میناؤں کو دیکھنے لگی جو ریل کے پہیوں کی گھڑگھڑاہٹ سے بے نیاز انسانوں کے چڑی مار پن سے بے بہرہ، بلدان کی سطح سمندر سے آٹھ ہزار فٹ بلند پہاڑی کی آزاد فضا میں پٹریوں سے کچھ دور سبز خودرو گھاس میں کیڑے تلاش کر رہی تھیں۔ راہل کو سردی لگنے لگی تھی، اس لیے اس نے کوٹ کے کالر کھول کر گلے کو ڈھانپ لیا تھا۔ شیل سوتی ساڑھی کا پلو ہی سر اور کانوں پر لپیٹ کر خاموش بیٹھی تھی اور سر سری نواس اپنے پائپ میں تمباکو بھرنے میں مصروف تھے۔ ان کی پتنی لیڈی سری نواس کشمیری گرم شال لپیٹے سمٹی ہوئی بیٹھی تھی۔ ان کے لیے یہ سردی کافی تکلیف دہ تھی، حالانکہ وہ شہر میں رہ کر ایسی فضا کے خواب دیکھا کرتی تھیں۔

صحت افزا مقامات میں بلدان کو خاص شہرت حاصل تھی، کیونکہ نہ صرف اس کا قدرتی حسن جاذب نظر تھا، بلکہ یہاں رہائشی انتظامات بھی بڑے موزوں تھے۔ بالائی حصے

میں مشرقی پہاڑی سے لے کر وادی تلک نگم اسٹیٹ پھیلی ہوئی تھی۔اس زمیندار کو کسی زمانے میں راجا کا خطاب مل چکا تھا،اس لیے وہ راجا نگم کہلاتا تھا اور اس کی اولاد بھی اسی اعزاز کی مستحق قرار پائی۔نگم اسٹیٹ نے اس ہل اسٹیشن پر تبدیلیٔ آبوہوا کی خاطر آنے والوں کے لیے موزوں مقامات پر چھوٹے چھوٹے بنگلے بنوا رکھے تھے، جہاں قیام کرنے والوں کو اسٹیٹ کی طرف سے ہر قسم کی سہولتیں حاصل رہتیں۔البتہ ان بنگلوں کا انھیں کافی کرایہ ادا کرنا پڑتا۔عام طور پر شہر کے دولت مند لوگ موسمِ گرما گزارنے کے لیے یہیں آیا کرتے تھے اور پورے پورے سیزن کے لیے یہ بنگلے پہلے سے بک ہو جاتے تھے۔نیچے خودرو جنگلی درختوں سے ڈھکی ہوئی سبز وادی میں یہاں کے قدیم پہاڑی باشندوں کی بستی تھی، جن کی کئی نسلیں یہیں گزر گئی تھیں۔انھوں نے کبھی راجا نگم کو اپنا راجا نہیں مانا تھا، کیونکہ زمیندار سے راجا بننے کے بعد راجا نگم بہت مغرور اور ظالم بن گیا تھا۔وہ ان غریب بستی والوں سے بڑی نفرت وحقارت کا برتاؤ کیا کرتا تھا،اس لیے بستی والے اپنا علاحدہ مکھیا چن کر اس کی اطاعت کیا کرتے تھے۔راجا سے وہ اس کی زندگی میں ہی بیزار رہتے تھے اور اس کی موت کے بعد بھی اسے اچھے نام سے یاد نہ کرتے تھے۔انھیں نگم اسٹیٹ میں داخل ہونے کی بھی ممانعت تھی، لیکن ہلدان کا ریلوے اسٹیشن کیونکہ سرکار کی ملکیت تھا،اس لیے کچھ لوگ وہاں مزدوری کرنے آجایا کرتے تھے، دو تین اسٹیشن کے پوٹرز میں بھی شامل تھے۔

ٹرین جب خنکی کی آغوش میں ایک فرلانگ تک پھیلے ہوئے ایک چھوٹے سے پہاڑی اسٹیشن پر رکی تو پلیٹ فارم پر سوائے چند قلیوں، ایک اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر اور چار پانچ مسافروں کے کوئی نہ تھا۔اس کا یہ سُونا سُونا ماحول بھی شہر کی مصروف زندگی سے فرار ہو کر آنے والوں کو بہت بھلا معلوم ہوا۔ایک ۳۰۔۳۲ سالہ تندرست سانولا جوان آدمی اور بھی اس اسٹیشن پر موجود تھا، جس نے سرمئی گرم پتلون پر چمڑے کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔اس سے کچھ فاصلے پر پیچھے ایک ادھیڑ عمر کا پہاڑی مؤدب کھڑا ہوا تھا۔شاید وہ اس کا نوکر تھا۔

سرسری نواس نے ایک ہی نظر میں پورے اسٹیشن کا جائزہ لے لیا۔انھوں نے شیل کے چہرے پر بھی سکون کے آثار پائے اور خوش ہو کر اپنی مسز کو اشارہ کرنے لگے کہ بیٹی کی طرف دیکھیں۔پریما تو تھی بھی بڑی چنچل۔سب سے پہلے وہی کمپارٹمنٹ سے کود کر باہر نکلی اور اپنا مفلر گلے میں لپیٹتے ہوئے ناک اونچی کر کے لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔اسے یہ بھی احساس نہ ہوا کہ سامنے ہی وہ نوجوان کھڑا اسے مسکراتی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔پھر راہل گاڑی سے اترا اور اس کے بعد شیل۔اور شیل کے بعد سرسری نواس اپنی پتنی کے بازو میں ہاتھ دیے ہوئے باہر آئے۔اسی وقت پاس والے سرونٹس کلاس سے ان کے تین نوکر، جن میں ایک موٹی سی سانولی آیا بھی شامل تھی، دوڑتے ہوئے آپہنچے اور اندر سے سامان باہر نکالنے لگے۔اور نوجوان بڑھ کر ان کے قریب آ گیا۔سرسری نواس کو ادب سے صبح کا سلام پیش کرتے ہوئے وہ خود ہی ان سے مخاطب ہو گیا۔

''میں نگم اسٹیٹ کا منیجر ہوں اور اگر میں غلطی پر نہیں تو آپ سرسری نواس...''

''آپ بالکل غلطی پر نہیں ہیں۔'' سرسری نواس نے مسکراتے ہوئے بات کاٹ دی۔''میں ہی سرسری نواس ہوں اور یہ میری پتنی، یہ میرے بچے۔'' انھوں نے ایک ہی سلسلے میں سب کا تعارف کرا دیا۔منیجر نے باری باری سب کو سر کی خفیف سی جنبش سے سلام کیا، لیکن راہل کے ساتھ ساتھ پریما نے بھی جب مصافحے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا تو اسے ہاتھ بھی ملانا پڑا۔پریما سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے اپنا نام بھی بتا دیا۔

''لوگ مجھے ونود کہتے ہیں۔''

''اور آپ کیا کہتے ہیں؟'' وہ شوخی سے پوچھ بیٹھی۔اور ونود اس اچانک بے تکلفی پر سٹ پٹا گیا۔سرسری نواس ہنس پڑے۔

''اس کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہے۔'' انھوں نے بیٹی کی تعریف کی۔

''وہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔'' ونود مسکرا دیا۔پھر وہ اپنے نوکر کی طرف پلٹا۔''دیکھ کیا

Akram Allahabadi

رہے ہو، سامان اتارنے میں ان کی مدد کرو۔" اس نے سرسری نواس کے ملازموں کی طرف اشارہ کر کے اس سے کہا۔ اور وہ جلدی سے آگے بڑھ کر ان میں شامل ہو گیا۔ "آپ کے لیے یہاں کے سب سے شاندار بنگلے کا انتظام کیا گیا ہے۔ باہر کار موجود ہے، چل کر تشریف رکھیے۔" اس نے سرسری نواس کی رہنمائی کی۔ "سامان نوکر لا ہی رہے ہیں۔"

"ہاں ہاں، چلیے چلیے۔" سرسری نواس جلدی سے آگے آگے ہو لیے۔ اس کا خاندان پیچھے چلنے لگا۔

اسٹیشن کے باہر ایک ڈاج اسٹیشن ویگن موجود تھی، جس کے اسٹیئرنگ پر ایک بوڑھا ڈرائیور بیٹھا اونگھ رہا تھا، وہ ان کے قدموں کی چاپ سن کر چونک پڑا اور جلدی سے گاڑی سے اتر آیا۔ ونود نے پچھلی نشستوں پر سب کو بٹھا دیا اور خود آگے ڈرائیور کے پاس بیٹھ گیا۔

"میں اپنی گاڑی بھی ساتھ لانے والا تھا، لیکن آپ کا خط ملنے پر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔" سرسری نواس نے کہا۔

"یہاں اس کی زیادہ ضرورت بھی اب نہ پڑتی اور پھر یہ کار بھی آپ کی سروس میں ہی رہے گی۔" ونود نے پلٹ کر جواب دیا۔

ملازم سامان اب اوپر باندھنے لگے تھے۔ چھوٹی چھوٹی چیزیں اندر ہی رکھ دی گئیں، لیکن ان کے بعد ملازموں کے لیے جگہ نہ بچی، اس لیے انھیں ونود کے ملازم کے ساتھ پیدل ہی آنا پڑا۔ کار بلدان کی پر پیچ پہاڑی راہ پر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔

☆☆☆☆☆☆

"یہ رہا بنگلہ آپ کا، شانتی گنج۔"

خاردار تاروں سے گھرے ہوئے ایک باغیچے والے بنگلے کے پھاٹک میں کار کے داخل ہونے پر ونود نے انھیں اشارے سے بتاتے ہوئے کہا۔

Akram Allahabadi

بنگلہ بڑا پرسکون اور سادہ نظر آ رہا تھا، لیکن بناوٹ میں خوشنما اور نیا ہی معلوم ہوتا تھا، یا ممکن ہے ہر سیزن میں اس کا رنگ وروغن اور صفائی کی جاتی ہو۔ بہر حال سرسری نواس اسے سرسری نظروں سے دیکھ کر بھی ناخوش نہیں ہوئے۔

پورٹیکو میں کار سے اترتے ہی ونود نے بنگلے کی چابی سرسری نواس کو پیش کر دی۔ ملازم سامان اتارنے لگے۔ سرسری نواس نے بنگلے کا دروازہ اپنے ہاتھ سے کھولا اور جب وہ اندر داخل ہوئے تو انھیں ہر چیز قرینے سے سجی ہوئی ملی۔ یہ چھوٹا سا بنگلہ اپنے محل وقوع اور اپنی سادہ خوش نمائی کے اعتبار سے سب ہی کو پسند آیا۔

''یہ ٹھیک ہے۔'' سرسری نواس نے تھکے ہوئے سے انداز میں صوفے پر گرتے ہوئے کہا۔ ''ویسے ہمیں توقع نہ تھی کہ یہاں اتنا موزوں انتظام ہوگا۔''

''اسٹیٹ تمام قیام گاہوں کا اسی مستعدی سے انتظام کرتی ہے۔'' ونود نے بتایا۔

''کیوں نہ کرے گی، آپ منیجر جو ہیں اس کے۔'' پریما سے چپ نہ رہا گیا۔

''اس حسنِ زن کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔'' ونود نے سر کو ذرا سا جھکا کر کہا۔

''نہیں نہیں، منیجر صاحب۔ حسنِ زن تو پریما دیوی ہیں۔'' راہل بھی بولنے میں پیچھے نہ رہا اور اس جملے پر سر اور لیڈی سری نواس دونوں بے ساختہ ہنس پڑے۔ ایک خفیف سی پھیکی سی مسکراہٹ سوشیل کے ہونٹوں پر بھی آ کر رہ گئی۔

''پھر مجھے اجازت دیجیے، اسٹیشن ویگن مجھے میرے آفس گاہ پر چھوڑ کر آ جائے گی اور آپ کی سروس میں رہے گی۔'' ونود نے اجازت طلب کرتے ہوئے کہا۔

''پہلے تو ہم نے یہی سوچا تھا کہ اپنی کار ساتھ لائیں گے، مگر آپ کا خط ملنے پر ارادہ بدل دیا۔'' سرسری نواس نے کہا۔

''دراصل اس اسٹیٹ کی رانی صاحبہ جو شہر میں رہتی ہیں بڑی کنجوس واقع ہوئی ہیں۔ یہ ان کی ہی ہدایت ہے کہ اسٹیشن ویگن یہاں بیکار ہی رہتی ہے، اس لیے اسے معقول کرائے پر

مہمانوں کی سروس میں دے دیا جائے۔" ونود نے بتایا۔

"خیر، خیر، ان کا خیال بھی ٹھیک ہی ہے۔ آخر جاگیر کی آمدنی تو ہونی ہی چاہیے۔" سرسری نواس مسکرائے۔ "اور اچھا ہے کہ ہم بھی قباحت سے بچ گئے۔ ایسی پہاڑیوں پر کار کا سفر بھی خطرناک ہوا کرتا ہے۔"

"آپ تو جیسے پیچھا چھڑا کر بھاگ رہے ہیں، ونود صاحب۔" پریما بیچ میں ہی بول پڑی۔

"جی نہیں، میرا مطلب تھا کہ آپ لوگ ایٹ ہوم ہو جائیں، میں پھر حاضر ہو جاؤں گا۔" ونود نے گھبرا کر کہا۔

"آپ کی حاضری تو بعد میں بھی لی جا سکتی ہے، سرِ دست کم از کم چائے پی کر جایئے۔"

سرسری نواس نے بیٹی کی تائید کی۔ اتنے میں رسوئیا، جوان کے ساتھ ہی شہر سے آیا تھا، آ پہنچا۔

"صاحب، اِدر تو کیچن میں ساب سامون (سامان) موزود (موجود) ہائے۔" اس نے بڑے تعجب سے بتایا۔ وہ ایک بوڑھا گوانیز تھا، جو سرسری نواس کے پاس کئی سالوں سے ملازم تھا۔

"تیس سو روپے ماہوار کرایہ یوں ہی تو نہیں لیا جاتا۔" ونود نے پلٹ کر اسے جواب دیا۔

"تو چلو، میں تمہارے کچن کی مہورت کرتی ہوں۔ ونود صاحب، آپ چائے پی کر ہی جایئے گا۔"

پریما یہ کہہ کر اپنی ساڑھی کا پلو کمر پر لپیٹتی ہوئی رسوئیا کے ساتھ چلی گئی۔

"ہماری سوشیل جتنی خاموش اور سست ہے، پریما اتنی ہی تیز اور بے دھڑک ہے۔"

Akram Allahabadi

سرسری نواس نے کہا۔ونود کو بیٹھ جانا پڑا۔

سرسری نواس لباس تبدیل کرنے چلے گئے۔لیڈی سری نواس بھی ان کے پیچھے چلی گئیں۔صرف راہل اور سوشیل رہ گئے۔راہل ونود سے باتیں کرنے لگا۔اور بہت جلد بے تکلف ہوگیا۔سوشیل خاموشی سے بیٹھی سنتی رہی۔

''کیا تمہاری بڑی دیدی کچھ بیمار ہیں؟''ونود نے اس سے سوشیل کے بارے میں پوچھا۔

''نہیں تو،مگر چپ چاپ رہتی ہیں۔یہ ان کی ہمیشہ سے عادت ہے۔بس جیسے ہمیشہ کچھ سوچتی رہتی ہوں۔اسی لیے ڈیدی انھیں یہاں لائے ہیں کہ شاید ان کی تندرستی بہتر ہوجائے اور خوش ہوجائیں۔''راہل نے بتایا۔

''آب وہوا کے اعتبار سے تو یہ ہل اسٹیشن انتہائی خوشگوار مقام ہے۔''ونود نے کہا۔ اور پھر سوشیل کی طرف دیکھنے لگا۔سوشیل نے اسے ایک نظر دیکھا،پھر توجہ دوسری طرف پھیر لی۔

''اگر میرا یہاں موجود ہونا آپ کو ناگوار گزر رہا ہو تو مجھے اجازت دے دیجیے۔''ونود نے سوشیل کو مخاطب کر کے اٹھتے ہوئے کہا۔

''جی نہیں تو،یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا؟''وہ چونک کر بولی۔

''آپ کا موڈ بتا رہا ہے۔''

''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔دراصل بعض لوگ بولنا زیادہ پسند کرتے ہیں اور بعض سننا زیادہ پسند کرتے ہیں۔''وہ خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''بہرحال اگر آپ تنہائی پسند بھی ہیں تب بھی اس ماحول میں آپ کا موڈ ضرور بدل جائے گا۔قدرتی حسن سے مالامال یہ خطۂ زمین اور ایسی پر بہار فضا زندگی میں ایک انقلاب پیدا کردیتی ہے۔''ونود نے کہا۔

''بدقسمتی سے میرے گھر والوں کو یہ شبہ ہے کہ میں بیمار ہوں،یا میرے ذہن پر کوئی

(spell) قائم ہے۔اسی لیے وہ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔حالانکہ میں اچھی خاصی ہوں۔ اب میں اس عادت کو کیا کروں کہ میں زیادہ بولتی نہیں۔"

"چلیے، کم از کم میرا ذہن تو صاف رہے گا کہ آپ کی عادت مجھے معلوم ہوگئی، ورنہ میں سمجھا تھا کہ یا تو آپ بہت مغرور ہیں یا منتشر الحواس۔" ونود مسکرا دیا۔

وہ اس قدر گفتگو کر کے پھر چپ ہوگئی اور ونود، راہل کے طرف متوجہ ہوگیا۔راہل اسے بتانے لگا کہ وہ اسی سال ایس۔ایس۔سی۔کے امتحان میں بیٹھنے والا ہے اور فٹ بال کا بڑا اچھا کھلاڑی ہے۔اسے ایئر گن سے چڑیاں مارنے کا بہت شوق ہے بلکہ وہ تو خاص کر اسی لیے یہاں آیا ہے۔پھر اس نے اپنی ایئر گن اسے لا کر دکھائی۔ونود نے، جو اس کی باتوں سے دلچسپی لی تو اس نے گفتگو کا ایک سلسلہ چھیڑ دیا۔اسکول کی باتیں، گھر کی باتیں، پھر شکار کی باتیں۔

"سب سے مشکل شکار تو ہد ہد کا ہوتا ہے۔" وہ ونود کو ہی سکھانے لگا۔"ہد ہد آواز ہوتے ہی کبھی سیدھا یا آگے کی کو نہیں اڑتا، بلکہ اچھل کر اوپر اڑتا ہے۔"

"تب تو ہائی جمپ چمپئن ہونا چاہیے اسے۔" ونود نے ہنس کر مشورہ دیا۔

"میں ہمیشہ ہد ہد کے پیٹ کا نشانہ لے کر اس سے چار انچ اوپر گولی چلاتا ہوں، بس ادھر وہ اچھلا اور گولی اس کے پیٹ میں۔" راہل اس کے جملے پر دھیان دیے بغیر کہتا رہا۔

"چڑی ماروں میں خاص پوزیشن رکھتے ہیں یہ۔" دروازے سے پریما کی آواز سنائی دی۔وہ چائے کی ٹرے خود ہاتھوں میں سنبھالے اندر آرہی تھی۔

"تو خود ہوگی چڑی مار۔دیدی، میرا مذاق مت اڑایا کرو۔" راہل نے منہ لٹکا لیا۔

"ہونہہ، چڑیاں ہی تو مارتے ہو، کون سا شیر مارا ہے کبھی جو شان بگھاری جارہی ہے۔" پریما ٹرے میز پر رکھتے ہوئے بولی۔

"دیدی، چائے تو میں بنا لائی، اب کپ میں تم تیار کرو۔" یہ کہتی ہوئی وہ اس انداز

میں دونوں ہاتھ جھاڑ کر صوفے پر بیٹھ گئی جیسے کوئی بہت بڑی مہم سر کر کے آئی ہو اور بہت تھک گئی ہو۔ سوشیل نے نہ تو انکار کیا، نہ جواب دیا۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر قریب آئی اور چائے تیار کرنے لگی۔

''راہل، تمہیں پہلے غسل کرنا چاہیے تھا۔'' وہ راہل سے بولی اور اس وقت ونود کو احساس ہوا کہ گھر کے لوگ اس کی عزت بھی بہت کرتے ہیں۔ کیونکہ راہل نے اسے کوئی ٹیڑھا جواب نہیں دیا، بلکہ 'اچھا، دیدی' کہہ کر اٹھ کر چلا گیا۔ سوشیل نے دو پیالیاں ہی بنائیں۔ ایک ونود کو دی اور ایک پریما کو۔

''اور آپ نہ لیں گی؟'' ونود نے پوچھا۔

''میں نے راہل کو جو نصیحت کی ہے، اس پر مجھے خود بھی تو عمل کرنا چاہیے۔'' سوشیل نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

چائے ختم کر کے ونود اٹھ کھڑا ہوا۔

''کار میں لے جا رہا ہوں، ڈرائیور سے واپس بھیج دونگا۔'' وہ باہر جاتے ہوئے پریما سے ہی بولا۔

''ہم لوگ شام کو گھومنے نکلیں گے۔ آپ بھی آجاتے تو اچھا تھا۔'' پریما نے فرمائش کی۔

''شام کو بھی شاید نہ آسکوں، کام بہت ہے۔ ویسے میں ڈرائیور کو ہدایت کر دوں گا کہ اچھی طرح آپ لوگوں کو سیر کرائے۔ اب تو وہ آپ کی ہی سروس میں رہے گا۔'' ونود نے کہا اور باہر نکل گیا۔

''تم بہت جلد ہر ایک سے بے تکلف ہو جاتی ہو، پریما۔ یہ اچھی بات نہیں۔'' سوشیل نے اسے سمجھایا۔

''تم ہی اٹھارھویں صدی کی بڑھیا بنی بیٹھی رہو، دیدی۔ میں جسے شریف آدمی سمجھتی

ہوں، اسی کو منہ لگاتی ہوں۔" پریما نے ناراض لہجے میں کہا۔

"خیر، ونود بابو تو منہ نہیں لگے تمہارے۔" یہ کہتے ہوئے سوشیل مسکرادی اور پریما بھڑک اٹھی۔

"ہاں ہاں، میں ہی لگتی ہوں ان کے منہ۔ اب آئیں تو ذرا۔" وہ یہ کہہ کر پیر پٹکتی باہر نکل گئی۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

کوئی بنسری بجائے

ڈاج اسٹیشن ویگن گھاٹی کی پتلی بل کھاتی سڑک سے گزر رہی تھی۔نشیب میں ساگوان کے درختوں کے جھنڈ سر اٹھائے کھڑے تھے اور کھا کر کے پتوں نے دور تک زمین کو ڈھانپ رکھا تھا۔اوپر سے دیکھنے پر جھاڑیوں کے درمیان تاریک غار سے نظر آتے تھے۔جنگل گھنا تھا، لیکن یہاں خوفناک درندے نہ تھے۔نشیب سے بلند ہوتی سطح پر درختوں کے جھنڈ ابھرتے چلے آتے تھے۔یہ سڑک پہاڑی کو کاٹ کر بنائی گئی تھی۔اس طرح کہ دائیں سمت نشیب میں جنگل دکھائی دیتا اور بائیں سمت ابر پوش بانگڑاہل، جس کے بالائی حصے پر بادلوں کی کہر چھائی رہتی اور اس کی چوٹی ان ہی بادلوں کی کہر سے ڈھکی رہتی، جہاں سے ٹھنڈے پانی کے باریک چشمے کلبلاتے ہوئے نیچے آتے اور گھاٹی تک پہنچ کر سرسوندی میں شامل ہو جاتے۔

کار کو اسٹیئرنگ کا بوڑھا ڈرائیور، اکبر خاں، ڈرائیو کر رہا تھا۔یہاں سے دور گھاٹی کے اس پار نشیبی وادی میں پہاڑیوں کی بستی کے آثار نظر آ رہے تھے۔راہل ڈرائیور کے پاس ہی بیٹھا تھا اور پچھلی نشست پر سوشیل اور پریما بیٹھی تھیں۔سرسر نواس اور ان کی مسز تکان زیادہ ہونے کی وجہ سے نہیں آئے تھے۔انھوں نے بچوں کو ہی سیر کے لیے بھیج دیا تھا۔

ڈرائیور تجربہ کار تھا اور اس علاقے سے اچھی طرح واقف معلوم ہوتا تھا۔وہ کافی دیر سے کار میں سیر کر رہے تھے اور شام کا دھندلکا چھا جانے لگا تھا۔سورج بانگڑاہل کے پیچھے چھپ چکا تھا، لیکن اس کی سرخی ابھی پہاڑی کی اوٹ سے جھلک رہی تھی۔پریما فضا کی تازگی سے لطف لیتے ہوئے کار کی کھڑکی سے سر نکال کر لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی۔

''ڈرائیور، وہ دور نشیب میں کونسی آبادی نظر آ رہی ہے؟'' پریما نے اکبر خاں سے پوچھا۔

Akram Allahabadi

''بابا، وہ ادھر کا پہاڑی لوگ کا بستی ہے۔ بھوت پرانا بستی ہے۔'' ڈرائیور نے بتایا۔

''مگر ہم نے تو کسی پہاڑی یا دیہاتی کو اس علاقے میں نہیں دیکھا؟'' راہل نے کہا۔

''اپنا اسٹیٹ کا راجا صاحب ایک مرتبہ ان سے ناراض ہوگیا تھا، تب ہی سے ان لوگ کا اسٹیٹ میں آنا منع ہے۔ ویسے اپنا منیجر صاحب اچھا دل کا آدمی ہے، وہ منع نہیں کرتا۔'' ڈرائیور نے بتایا۔

''تمہارا منیجر صاحب یہاں اکیلے ہی رہتے ہیں؟'' راہل نے سوال کیا۔

''اِدر تو اکیلا ہی رہتا ہے۔ اس کا ماں باپ اُدر جبل پور میں رہتا ہے۔'' ڈرائیور نے بتایا۔

''اور بیوی بچے؟'' اس بار پریما نے پوچھا۔

''اما را منیجر صاحب ابھی بہ فضل خدا کنوارا ہے۔ بولتا ہے، اکبر خاں، شادی کا وبال جی کا جنجال، آزاد مرد، آزاد پنچھی۔ کبوتر کا موافق، کبھی آسمان پے، کبھی زمین پے۔'' اکبر خاں نے ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بتایا۔

''شاید تم بھی کنوارے ہی ہو اب تک۔'' راہل نے اس پر فقرہ چست کیا۔

''نہیں بابا، اُدر کامل میں اما را ایک درجن فوج ہے۔ صاحب ٹھیک بولتا۔ ام کو تجربہ ہوا۔ اب پروردگار اس پے اپنا رحم کرے۔'' اکبر خاں یہ کہہ کر خاموش ہوگیا۔ پریما کو اکبر خاں کی باتیں کچھ اچھی نہیں لگیں، مگر وہ بھی خاموش ہی رہی۔ سوشیل تو ابھی تک کسی خیال میں محو باہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ لیکن اچانک اکبر خان کے کان کھڑے ہو گئے۔ پہاڑی پر کہیں بانسری کی باریک سریلی لے سنائی دینے لگی تھی۔ بانسری کی یہ آواز بتدریج بڑھتی گئی۔ ڈرائیور نے گھبرا کر پہاڑی کی طرف دیکھا اور کار کی رفتار تیز کر دی۔

بانسری کی گونج پوری پہاڑی پر پھیلتی جا رہی تھی۔

ڈرائیور نے رفتار اور تیز کر دی۔

Akram Allahabadi

بانسری کی آواز اب گویا ہر پیڑ، ہر پتھر، ہر چٹان سے نکلنے لگی تھی۔ مگر دور یا قریب، کوئی بجانے والا کہیں نظر نہیں آتا تھا۔

اس سریلی گونج کی غنائیت سارے ماحول پر مسلط ہوگئی تھی اور ڈرائیور کے چہرے پر خوف وتذبذب کے آثار اور گہرے ہو گئے تھے۔ سوشیل تو اس آواز میں بالکل کھو گئی تھی اور پریما اور راہل حیران حیران سے باہر کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''تم اتنی تیز گاڑی کیوں چلا رہے ہو، اکبر خاں؟'' راہل سے بالآخر نہ رہا گیا۔

''بابا، تم نہیں جانتا۔ اِدر کئی سالوں سے یہ آواز پہاڑی پر گونجتی سنائی دیتی ہے، مگر بانسری بجانے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ اللہ جانے کیا اسرار ہے۔ کوئی بولتا کسی کا روح ہے، کوئی بولتا آسیب ہے۔ خوچہ کمال کا بات ہے کہ پہاڑی پر باہر سے سنو دور سے یہ آواز آتا۔'' اکبر خاں نے حیرت وخوف سے متاثر لہجے میں کہا۔

''کوئی چھپ کے بجاتا ہوگا، لوگوں کو ڈرانے کے لیے؟'' پریما نے اسے کوئی اہمیت نہ دیتے ہوئے رائے دی۔

''نہیں، اے بابا۔ بستی والا بولتا کوئی گاڈریا اندر مر گیا تھا۔ اس کا روح بھٹکتا ہے۔ وہ بولتا ایسا بانسری کوئی نہیں بجا سکتا۔'' اکبر خاں نے کار کی رفتار تیز رکھتے ہوئے بتایا۔ اس بار پریما بھی ہمہ تن گوش ہو کر اس آواز کو سننے لگی، جو کبھی تو قریب اور بالکل قریب معلوم ہونے لگتی اور کبھی دور۔

اچانک سوشیل کی چیخ نے انھیں اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کر چیخ پڑی تھی۔ پریما حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

''کیا ہوا، دیدی؟'' اس نے پوچھا۔

''وہ... وہ بانسری۔'' سوشیل نے بہ مشکل کہا۔

''دیدی ڈر گئیں شاید۔'' راہل نے اگلی نشست سے اپنی رائے دی، لیکن سوشیل

آنکھیں پھاڑے خلا میں گھورتی رہی ۔اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔اکبرخاں نے بھی پلٹ کر دیکھا،مگر کچھ بولا نہیں ۔وہ کارکو اس گھاٹی سے نکال لایا اور بانسری کی آواز اب دور اور مدھم ہوگئی۔

وہ اب گھر کی طرف لوٹ رہے تھا ور سوشیل کی کیفیت بھی اعتدال پر آرہی تھی۔

''تمہیں کیا ہوا تھا،دیدی؟ کیوں چیخی تھیں؟''پریمانے اس سے سوال کیا۔

''کچھ تو نہیں، مجھے کیا ہوا ہے؟'' کہہ کر سوشیل خاموش ہوگئی۔مگر راستے میں ہی اکبرخاں نے کار دھیمی کردی۔ وہ دیکھنے لگے،ان کا راستہ ایک گدھے سوار نے روکا تھا۔ وہ گدے پر بیٹھا بیچ راستے پر چلا آرہا تھا۔اس کا حلیہ دیکھ کر راہل بے ساختہ ہنس پڑا۔اس نے جوکروں جیسی لمبی چونچ دار ٹوپی پہنی تھی ۔بدن پر ایک پھٹا پرانا فوجی اوورکوٹ تھا۔وہ بوڑھا،مگر تندرست تھا۔اس کے ہاتھوں میں ایک بچوں کے کھلونے جیسا طنبورہ تھا،جسے بے ہنگم طور سے بجاتا ہوا وہ ایک عجیب سا گیت گارہا تھا۔

سورج روز ابھرتا ہے

سورج روز ڈوبتا ہے

مگر بادلوں سے ڈھکے پہاڑوں میں

اس بے قرار روح کو قرار کہاں

اس کی شہزادی گم ہوگئی ہے

مرغی کا انڈا گم ہوگیا ہے

ہاتھی کا بچہ گم ہوگیا ہے

الّو کا پٹھا گم ہوگیا ہے

اور میرے گدھے کا دادا گم ہوگیا ہے

مگر سب کو چین آجائے گا

نہ آئے گا تو اس روح کو

Akram Allahabadi

جو ویرانوں میں بھٹک رہی ہے
ابدی سکون کی تلاش میں
اپنی منزل کی تلاش میں
اپدیش گانا مت گاؤ
ورنہ تمہارا گدھا رشک کرے گا
کہ تم بہت کچھ گا لیتے ہو
ہائے لیکن کون سمجھے
کہ یہ کام کی باتیں ہیں

وہ گاتا ہوا بالکل قریب آ گیا، لیکن کار کے ہارن اس کے کانوں پر اثر نہ کر سکے۔

''کوئی پاگل معلوم ہوتا ہے؟'' پریما نے اسے قریب سے دیکھ کر کہا۔

''بستی کا لوگ بولتا ہے کہ یہ پاگل خدا رسیدہ مجذوب فقیر ہے۔ کوئی اس کو نہیں ستاتا، سب اس کی عزت کرتا ہے۔ وہ لوگ سے اپدیش بولتا ہے۔'' اکبر خاں نے بتایا۔

''ارے، مگرا سے راستے سے تو ہٹاؤ۔'' راہل نے کہا۔

''آپ سے ہٹ جائے گا۔ مردِ خدا کا بد دعا نہیں لینا چاہیے۔'' یہ کہہ کر اکبر خاں نے کار ہی روک دی۔

اپدیش مسکرایا اور گدھے کو ذرا سا موڑ کر کنارے ہوتا ہوا کار کے قریب سے گزرنے لگا۔

خدا اس پٹھان کو چٹان بنائے

بیچارہ اچھا آدمی ہے.
مگر ایک سور کی جاگیر میں نوکر ہے
راجا کی ایسی تیسی

Akram Allahabadi

پرجا کی بھی ایسی تیسی

دنیا کی بھی ایسی تیسی

کیسی تیسی

ویسی تیسی

ایسی تیسی

گائے جا اپدیش بیچارے گائے جا

ابے چل ہٹ

اور پھر وہ رک کر پٹھان کو گھورنے لگا۔

''اسلام علیکم، پاگل مجذوب صاب۔'' اکبر خاں نے مرعوب سے انداز میں اسے جلدی سے سلام کیا۔

''وعلیکم سلام، بھیا خان صاحب۔'' اپدیش گنگنایا۔ ''تمہارے ساتھ یہ کس کے انڈے بچے ہیں؟''

اس سوال پر پریما اور راہل تو ہنس ہی پڑے، مگر سوشیل بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔

''اِدر صاحب لوگ آیا ہے سیر کرنے۔''

''صاحب لوگ آیا ہے تو چلا بھی جائے گا۔''

''جو آتا ہے وہ جاتا ہے...

''اچھا وعلیکم سلام، ہم بھی چلے۔''

وہ گانے والے انداز میں بولا۔

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا ہی تھا کہ اچانک اس کی نظر اندر دوسرے سرے پر بیٹھی سوشیل پر پڑ گئی۔ وہ ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگا۔

''اوہ... راج کماری...'' اس کے حیرت سے کھلے ہوئے منہ سے نکلا اور وہ گدھے پر

Akram Allahabadi

سے فوراً اتر کر اسے سلام کرنے لگا۔سوشیل اسے حیرت سے دیکھنے لگی اور پریما مسکرادی،مگر اپدیش اسی انداز میں سر جھکائے پیچھے ہٹتا چلا گیا اور پھر اپنے گدھے کی لگام سنبھال کر بڑی خاموشی اور سنجیدگی سے کنارے کنارے آگے کی طرف چل پڑا۔

اکبر خاں راج کماری کے لفظ پر چونک رسوشیل کو دیکھنے لگا تھا اور ابھی تک دیکھے جارہا تھا۔پھر سر کو جھٹکتے ہوئے اس نے کار آگے بڑھادی،مگر راہل اور پریما پاگل اپدیش کو دیکھ دیکھ کر اب بھی ہنس رہے تھے۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

آدھی رات کو

ڈرائیور جب انھیں بنگلے پر چھوڑ کر ونود کے بنگلے کی طرف جانے لگا تو پریما نے اسے آواز دے کر روک لیا۔

''اکبر خاں، پہلے ایک بات بتاؤ، نہیں تو تمھیں جانے نہیں دیا جائے گا۔''

''پوچھو، بابا۔'' اکبر خاں نے کار روک دی۔

''اس پاگل نے جب دیدی کو راج کماری کہہ کر سلام کیا تھا تو تم چونکے کیوں تھے؟'' پریما نے سوال کیا۔

''اس مجذوب کا بات بڑا عجیب ہوتا ہے، بابا۔ کبھی کبھی اس کا بات سچ ہوتا، پیشین گوئی ہوتا۔ وہ بابا کو راج کماری بولا، اس میں بھی کوئی بات ہوگا۔'' اکبر خاں نے بتایا۔

''نہیں، اکبر خاں، تم سچی بات نہیں بتا رہے۔''

''بابا لوگ، حق کا بات تو یہ ہے کہ اُدر اسی بنگلے میں راجا صاحب کا بیٹی رہتا ہے، جسے راج کماری بولتا۔ ام نے سنا ہے کہ راجا صاحب اسے زہر دے کر مار ڈالا۔ اپنی جوان بیٹی کو خود زہر دیا۔'' اکبر خاں نے بتایا۔

''رام رے رام، کون کس کو زہر دیا؟'' پیچھے سے آیا کی آواز آئی۔ اس نے باہر آتے ہوئے پٹھان کا جملہ سن لیا تھا۔

''اوئے خدائی خوار، تمہارا جیسا بھینس کو کون زہر دے گا؟'' اکبر خاں ہنس پڑا۔

''کیا بولا تم؟ میں بھینس؟'' آیا بگڑ گئی اور پلٹ کر نوکر دینو کو آواز دینے لگی۔ ''دینو، جلدی آؤ، اِدر آؤ.. اِدر ہمارا انسلٹ ہوتا۔''

دینو اندر سے آواز سنتے ہی چیختا ہوا دوڑا۔

Akram Allahabadi

''کون ہے بے؟ کون میری میم صاحب کو حیران کرتا ہے؟ مار مار کے مرغا بنا دوں گا سالے کو۔'' وہ بڑبڑاتا ہوا باہر نکلا، مگر خاں کی شکل دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

''آؤ، آؤ، رستم بن گھستم کا بچہ۔ آؤ ام کو کو مرغا بناؤ۔ ام تم کو مرغی کا بچہ بنائے گا۔ خوچہ تمہارا اچار ڈال کے کھچڑی سے کھائے گا۔'' اکبر خاں آستین چڑھانے لگا۔ دینو وہیں رک کر رہ گیا۔

''خاں صاحب، ام تم کو مئیں بولا گاڈ کسم۔ ام تو سمجھا لو بولو ہے، اپنا گوانیز خانساماں۔'' دینو نے وہیں سے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

''اے دینو، امارا نیم بولو ہائے جان بولو۔ تم گلط کائے کو بولتا، سالا۔'' کچن کی کھڑکی میں سے اسے خانساماں نے ڈانٹا۔

''ارے ہاں ہاں، ہوئینگا۔ تیل لینے گیا تیرا نام۔'' دینو نے دانستہ اکبر خاں کی بجائے بولو سے الجھنے کی کوشش کی۔ تین ٹن کی نازک بدن آیا اپنے بھاری بھرکم عاشقِ صادق دینو کو قتل کر دینے والی ادا سے دیکھنے لگی۔ مگر اسے غیرت نہ آنی تھی نہ آئی، بلکہ اکبر خاں کی طرف دیکھ کر اس نے اور بتیسی نکال دی۔

''اکبر خاں، تم راج کماری کا ذکر کر رہے تھے نا۔'' پریما نے اسے یاد دلایا۔

''ہاں، بابا۔ ام بستی کے لوگ سے ایسا سنا ہے۔''

''مگر اسے کیوں زہر دیا گیا تھا؟''

''بابا، ام اِدر بھوت پرانا نوکر مئیں ہے۔ آپ منیجر صاحب سے پوچھا، وہ بتائے گا۔ ام کو سب واقعہ مئیں معلوم۔ بس اتنا معلوم ہے کہ راجا صاحب کا بیٹی کا نام راج کماری تھا۔ ام تو اسی لیے چونکا تھا کہ وہ فقیر مجذوب ایسا کیوں بولا۔''

''ارے پاگل تو پاگل... اچھا چھوڑو... میں خود نودبابو سے پوچھ لوں گی۔''

وہ یہ کہہ کر اندر چلی گئی۔ آیا پہلے ہی برا سا منہ بنا کر جا چکی تھی اور دینو اپنی توند

پھلائے کچھ دیر کھڑے رہ کر لوبو سے جھگڑا مول لینے کے لیے کچن کی طرف چلا گیا۔

☆☆☆☆☆☆

رات بڑی خنک، مگر سہانی تھی۔ چاند کی روشنی میں ابر کی مدھم سفید چادر بانگڑا ہلز کی چوٹی پر ڈھکی معلوم ہوتی تھی اور بادلوں کے ٹکڑے ٹکڑے گھاٹیوں تک پھیل گئے تھے۔ ہوا سرد تھی اور چھٹکی ہوئی بھرپور چاندنی میں بلدان کا قدرتی حسن اور نکھر گیا تھا۔ روشن و تاریک گوشے، چاندنی میں نہائے ہوئے پرسکون درخت اور ان کے سائے، بڑا دلفریب منظر پیش کرتے تھے۔

اس وقت ساڑھے ا بج چکے تھے۔ شہر کی مصروف زندگی میں لوگ رات گئے تک بھی جاگ لیتے تھے، لیکن اسٹیٹ کے تمام بنگلے اس وقت تاریک اور خاموش پڑے تھے، جیسے ان میں کوئی رہتا ہی نہ ہو۔ اور دور نشیب میں وادی کی آبادی میں کہیں کہیں چراغ ٹمٹماتے نظر آرہے تھے۔ جنگل کے حصے سے سیاروں کے چلانے اور آبادی سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ کہیں دور کسی درخت پر کوئی کھونسٹ 'چچاچخ' کی رٹ لگائے ہوئے تھا اور گاہے بگاہے کسی چکور کی آواز بھی سنائی دے جاتی۔ سارا ماحول سویا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

سرسری نواس، ان کی پتنی، پریما، راہل اور نوکر تک سب آرام کی نیند سو رہے تھے، لیکن نہ جانے کیوں سوشیل کو نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ اپنے اندر ایک عجیب سی بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ بنگلے کی داہنی سمت میں جس سرے والے کمرے میں وہ اور پریما سوتی تھیں، بانگڑا کی پہاڑی کے بالکل سامنے پڑتا تھا اور اس کی کھلی کھڑکیوں سے یہ ابر پوش پہاڑی صاف نظر آتی۔

نہ جانے کیوں سوشیل کو ایسا معلوم ہوتا جیسے یہ کمرہ، یہ قیام، اس کے لیے نیا نہ ہو۔ عجیب عجیب سے خیالات اس کے ذہن میں آرہے تھے۔ اسی نامعلوم ذہنی کشمکش میں وہ دو تین بار کھڑکی پر جا کر کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی نگاہیں چاند پر سے ہوتی ہوئیں بانگڑا ہل کی چوٹی پر پہنچ

کر مرکوز ہو جاتیں اور ذہن میں کچھ ایسی تاریکی سی چھا جاتی جیسے اس کا دماغ ایک خالی اور تاریک کوٹھڑی ہو۔ پھر وہ زبردستی آنکھوں میں نیند لانے لے لیے اپنے بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ اس نے بڑے پیار سے پریما کی طرف دیکھا۔ مست جوانی، بے سدھ سوئی ہوئی تھی۔ اسے اپنی یہ چھوٹی بہن بڑی پیاری لگتی۔ ننھی سی، منی سی، گوری چٹی پریما، جسے وہ پیار سے گود میں کھلاتی تھی اور جب اس کا منہ چومتی تو وہ ضد میں آ کر اس کا منہ نوچ لیتی یا رگڑ رگڑ کر اپنے گال صاف کرتی رہتی۔ کتنا پیارا تھا وہ بچپن، لیکن بہنوں کا پیار کبھی ختم نہیں ہوتا۔ پریما آج جوان ہو کر بھی اس کے لیے وہی ننھی منی پریما تھی۔ وہ اس کے اوپر جھک گئی اور اس کی پیشانی چوم لی۔ پریما شاید اپنی بچپن کی عادت کے مطابق نیند میں بھی کچھ کلبلائی، لیکن پھر کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔ سوشیل پیر پھیلاتی ہوئی اپنے بستر پر لیٹی ہی تھی کہ لیٹتے لیٹتے چونک پڑی۔ دور... بانگڑا کی پہاڑی پر کوئی بانسری بجا رہا تھا۔ وہی پراسرار آسیبی، مگر دل کھینچ لینے والی آواز۔ وہ ایک دم تڑپ اٹھی... اور کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔

روشن چاند جیسے بانگڑا ہل کے اوپر سے ہی ہو کر گزر رہا تھا۔ اس کی نگاہیں دور پہاڑی کے پیچھے خلاء میں گھورنے لگیں اور کان بنسری کی وہی مدھ بھری تان سننے لگے۔ بنسری کی گونج تیز ہوتی جا رہی تھی، جیسے ہوا کی رفتار کے ساتھ اسی طرف آ رہی ہو اور کچھ دیر بعد ہی وہ گونج جیسے سارے پہاڑ پر سنائی دینے لگی۔ وہ ساری فضا میں پھیل گئی۔ وہ بنگلے کے چاروں طرف ہوا میں تیرتی معلوم ہوئی اور سوشیل کی آنکھیں بانگڑا ہل کی ابر آلود چوٹی کو تکتے تکتے جیسے پتھرا گئی ہوں۔ اس کے ذہن میں تاریکی پھیلتی چلی گئی اور اس تاریکی سے اسے ایک سفید سا ہیولا، ایک سفید سا خاکہ ابھرتا معلوم ہوا۔ کسی انسان کا۔ جیسے کوئی بانسری ہونٹوں سے لگائے بجا رہا ہو۔ پھر اس نے چاند کی طرف دیکھا۔ چاند پھیل کر بڑا ہو گیا، بڑا ہوتا گیا، یہاں تک کہ وہ ایک روشنی کی چادر کی طرح زمین پر پھیل گیا اور اس روشنی سے پھر ایک سفیدی سی پیدا ہوئی جو قریب ہوتے ہوتے وہی سفید انسانی خاکہ بنتی گئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اسے بلا رہا ہو۔ کانوں میں بانسری کی

آواز اسی طرح گونج رہی تھی ۔اور اسے اپنا دل سینے سے باہر کھنچتا معلوم ہونے لگا۔

اس نے ایک جھٹکے سے دروازے کے پٹ کھول دیے اور باہر نکل گئی۔دروازے کے پٹ کھلنے کے شور نے پریما کو چونکا دیا۔اس نے غور سے کمرے میں دیکھا، سوشیل نہ تھی ۔وہ بستر سے نکلی اور گون پہنے ہوئے دبے قدموں سے دروازے تک آئی ۔پھر اس نے باہر جھانکا۔ وہ خود بھی بانسری کی اس تان کو فضا میں چاروں طرف گونجتے سن کر حیران رہ گئی، جیسے وہ پراسرار گونج بنگلے کا طواف کر رہی ہو۔

لیکن اسے دوڑ کر باہر نکلنا پڑا، جب اس نے سوشیل کو خوابناک حالت میں باغیچے کے روش پر چلتے ہوئے ٹھوکر کھاتے دیکھا۔وہ دروازے کی طرف جا رہی تھی ۔بالکل اس طرح جیسے وہ کوئی متحرک پتلا ہو۔

''دیدی...''پریما نے پیچھے سے آواز دی، لیکن سوشیل نے جیسے سنا ہی نہیں۔

''دیدی...''اس نے دوبارہ پکارا اور اس پر بھی جب جواب نہ ملا تو وہ دوڑ کر اس کے قریب پہنچ گئی اور اسے بازوؤں سے تھام کر جھنجھوڑنے لگی۔

''دیدی، تمہیں کیا ہوا ہے، دیدی؟''

جھنجھوڑنے پر سوشیل چونک پڑی اور بانسری کی آواز مدھم پڑ گئی۔پھر وہ آواز جیسے سمٹتی ہوئی بانگڑی کی پہاڑی کی طرف چلی گئی

''آں...کیا...؟ کیا بات ہے؟''

''تم کہاں جا رہی تھیں اس وقت؟''

''کہیں بھی تو نہیں ۔ارے ہاں، شاید میں باغیچے میں سیر کر رہی تھی۔''وہ چاروں طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''باغیچے میں سیر نہیں کر رہی تھیں، تم اپنے بستر سے اٹھ کر آئی ہو، کیا نیند میں چل رہی تھیں؟''

Akram Allahabadi

''مجھے معلوم نہیں...شاید...''

''اچھا چلو، کمرے میں چلو۔'' وہ اسے بازو سے تھام کر کمرے میں لائی۔اس نے دروازہ اندر سے بند کرلیا۔اس وقت اس نے سوشیل سے کچھ اور پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔سوشیل چپ چاپ بستر پر لیٹ گئی اور پریما نے بتی بجھادی، جو اس نے کمرے سے نکلتے وقت روشن کرلی تھی۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

پہلوان عاشق

ونود کا بنگلہ جس میں اسٹیٹ کا دفتر بھی تھا، زیادہ دور نہ تھا۔ زیادہ سے زیادہ میل بھر کا فاصلہ ہوگا۔ ویسے وہ شانتی کنج کے باغیچے سے صاف نظر آتا تھا۔ شانتی کنج اسی بنگلے کا نام تھا جس میں سرسری نواس کا خاندان ٹھہرا تھا، لیکن اسے اس نام سے کوئی نہیں پکارتا تھا، اسے یا تو بنگلہ نمبرا کہا جاتا تھا، یا راجا کا بنگلہ۔ راہل صبح صبح ٹہلتا ہوا ونود کی قیام گاہ پر پہنچ گیا۔ برآمدہ سونا نظر آرہا تھا۔ وہ ونود کو سویا ہوا سمجھ کر پلٹ ہی رہا تھا کہ کسی نے اسے آواز دی اور وہ رک گیا۔ آواز دینے والا ونود کا نوکر پہلوان تھا۔ وہ بستی میں بھی اسی نام سے مشہور تھا۔ شاید لوگوں نے اس کا مذاق اڑانے کے لیے یہ نام رکھا ہو۔ بہر حال اس کی شخصیت بڑی دلچسپ تھی۔ اکہرے بدن کا چھوٹے قد کا دبلا پتلا ادھیڑ عمر کا آدمی۔ چہرہ کسی سوکھے چھوارے سے مشابہت رکھتا تھا۔ بستی کے گھاسی چمار کے مشورے پر وہ 'ہنومان بل' کا گنڈا گلے میں ڈال کر پچھلے ۶ ماہ سے روز صبح ڈنڈ بیٹھک کیا کرتا تھا، لیکن گوشت تھا کہ بدن پر چڑھنے میں ہی نہ آتا تھا۔ اس نے گھاسی چمار سے اس کی شکایت بھی کی تھی، مگر گھاسی نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ اس کا بدن 'چور' ہے جو کشتی لڑنے کے وقت گدھے کی طرح پھول جائے گا اور طاقت تو دراصل ہڈیوں اور رگ پٹھوں میں آتی ہے۔ کوشت تو حرام خوروں کے چڑھتا ہے، یا پھر سست بیٹھنے والوں کے۔ چنانچہ اس کی بات پر یقین رکھ کر رگھو خود کو پہلوان کہنے اور کہلوانے لگا تھا۔ اسے پہلوان مشہور کرنے میں گھاسی کے پروپیگنڈے کو بھی دخل تھا، ورنہ ہنومان بل کے گنڈے کے پانچ روپے کیسے ہضم ہوتے۔

راہل کو آواز دینے والا رگھو ہی تھا۔ راہل نے اسے پہچان لیا۔ وہ اسے اسٹیشن پر بھی دیکھ چکا تھا اور بنگلے پر سامان اتر واتے ہوئے بھی، لیکن اس وقت صرف لنگوٹ میں وہ شمسان سے بھاگا ہوا کسی سوکھے مردے کا بھوت ہی معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے تیار کیے

ہوئے اکھاڑے کی مٹی بدن پر مل رکھی تھی۔ راہل اسے دور سے تو پہچان نہ سکا اور بغور اسے دیکھتا رہا۔ لیکن جب وہ خود قریب آیا تو راہل نے اسے پہچان لیا۔

''کہر (کدھر) بھول پڑے، چھوٹے بابو، سویرے سویرے؟''

''بس یونہی ٹہلتا ہوا آنکلا تھا۔ ونود صاحب تو سو رہے ہونگے ابھی؟'' راہل نے پوچھا۔

''کون منیجر صاحب؟ ارے مرگا بانگ دیوے نہ دیوے، جہاں پانچ بجے اوران کر (ان کی) آنکھ پٹ سے کھل جات ہے۔ اور آئے جات ہے رگھو پہلوان کی سامت۔ رام رام کا کلجگ ہے۔ نہ پوجا نہ پاٹ نہ اسنان۔ بس کرنو انگریج کے بھوت ہیں۔ انڈے سے نکلتے ہی چائے چائے چلائے لگت ہیں۔'' وہ بتانے لگا۔

''اور تم نے اپنا یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟'' راہل نے ہنس کر اس سے پوچھا۔

''اور لیو، ای حال ہے کہ پہلوانی ہے۔ ایسے ہن رگھو پہلوان نا ہیں کہے جات ہم۔ بڑے بڑے رستم لگون کا پلک جھپکائے چت گرائے دیا ہے۔'' رگھو اپنی تعریف کرنے لگا۔

''بے شک، وہ تو تمہاری حالت ہی بتا رہی ہے۔ اچھا اتنی پہلوانی کرتے ہو تو موٹے کیوں نہیں ہوتے؟''

''اے ہی تو بات ہائے۔ ہن تم نا ہیں سمجھ سکت، چھوٹے بابو۔ ای بات تو گھاسی چمار جانتا ہے کہ ہمارا چور بدن ہے، جہاں کسی کھاطر اکھاڑے میں ہم اترن اور بس گدھا ہس پھول جات ہے۔'' رگھو نے اپنے دبلے پن کی وجہ سمجھائی۔

''اچھا یہ محنت کیوں کر رہے ہو، کسی سے مقابلہ کرنا ہے کیا؟'' راہل اس مسخرے کی شخصیت میں دلچسپی لینے لگا۔

''سچ بتائے دئی کہ جھوٹ؟''

''جھوٹ کیوں، سچ ہی بولو نا۔''

Akram Allahabadi

''برا تو نہ مانیو؟''

''نہیں، کیوں؟''

''چھوٹے بابو، او تمہارا آیا ہے...اونک تگڑی سی۔''

''ہاں۔کیوں اس سے کشتی لڑنا ہے؟''

''ارے نا ہیں، اب تم سے کا چھپائی۔ہم کا اوسے اوہونے گیا ہے۔''

''یہ اؤ کیا ہوتا ہے؟''

''اب لیو، جیسے کچھ سمجھت ہی نا ہیں۔جرا بتاؤ تو مرد کو اورت سے کیا ہوئے جات ہے؟''

''کچھ عشق وشق کا معاملہ ہے کیا؟''

''اب ہے تو ہے، تم سے کا چھپائی۔ہائے، ایسی اچھی پہلوان اورتیا ملت کہاں ہے۔''

''مگر وہ ہمارا دینو بھی کم خطرناک نہیں ہے۔وہ تمہاری مرمت کردے گا۔اسے بھی آیا سے عشق ہے۔''

''ارے او کو تو ہم بھرتہ بنائے کے رکھ دیب۔اوکر ہم کا پھکرنا ہیں۔تم اجازت دیدیو بس۔''

''اچھا ایک ترکیب ہوسکتی ہے۔''

''تو بتاؤنا جلدی۔''

''تم اور دینو ڈویل لڑلو، جو جیت جائے، وہ آیا سے عشق کرے۔''

''ای دوبیل والا معاملہ تنک مسکل ہے۔ہمارپاس ایکو بیل نا ہیں ہے، کونو اور رستہ بتاؤ۔''

''دوبیل نہیں، میں ڈویل کہہ رہا ہوں۔''

''ای کا ہووت ہے؟''

''دو آدمی مقابلہ کرتے ہیں، ایک ہار جاتا ہے، دوسرا جیت جاتا ہے۔''

''ای مرے جیے والی بات اچھی نا ہیں، کستی لڑائے لیو جے سے جی چاہتا ہے۔''

''اچھا، وہی سہی۔ مگر تم کشتی کا نام نہ لینا، بلکہ آیا کے سامنے دینو کو للکارنا کہ مجھ سے ڈویل لڑلو، جو جیت جائے آیا اس کے گلے میں ہار ڈالے۔'' راہل نے وہیں ایک پتھر پر بیٹھتے ہوئے بتایا۔

''ای ہم کا منجور ہے۔''

''ارے راہل، تم۔'' پیچھے سے ونود کی آواز آئی۔ راہل نے پلٹ کر دیکھا، وہ گون پہنے برآمدے میں کھڑا تھا۔ راہل اٹھا اور راگھو کو جلد مقابلہ کرنے کی آخری نصیحت دیتا ہوا ونود کی طرف چلا آیا۔

''ذرا آپ کے پہلوان سے باتیں کر رہا تھا۔'' اس نے ہنستے ہوئے بتایا۔

''وہ کمبخت تو ایسی ہی حماقتیں کرتا رہتا ہے، مگر کام میں بڑا مستعد ہے۔ آؤ، اندر آؤ۔'' ونود نے برآمدے سے ہٹ کر کمرے کے دروازے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ راہل برجیس کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اِدھر اُدھر نظریں ڈالتا ہوا اندر چلا گیا۔ کندی سے ڈھکی ہوئی چائے ابھی تک میز پر رکھی تھی۔

''لو، چائے پیو۔'' ونود کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ پھر اس نے خود ہی ایک پیالی میں چائے انڈیل دی۔

''آپ اتنے بڑے بنگلے میں اکیلے ہی رہتے ہیں؟''

''ہاں بھئی، ابھی تک تو اکیلا ہی رہتا ہوں۔''

''کیسے جی لگتا ہوگا؟''

''مجھے تو یہ تنہائی خوشگوار معلوم ہونے لگی ہے۔''

Akram Allahabadi

''ہماری طرف آجایا کیجیے نا۔آپ کی بھی طبیعت بہلے گی اور ہماری بھی۔''

''کیوں نہیں،وقت ملے گا تو ضرور آیا کرونگا۔''

وہ کچھ دیر اور بیٹھا رہا۔راہل کے بارے میں خود اس کے خاندان والوں کا خیال تھ اکہ وہ اپنے وقت سے پہلے عقلمند ہوگیا ہے۔باتیں بے دھڑک کرتا اور بڑے بوڑھوں جیسی کرتا۔اور امریکن کامک پڑھ پڑھ کر تو اس کا دماغ ہی خراب ہوگیا تھا۔ہر وقت کسی نہ کسی کہانی کے ہیرو کے تصور میں خود بھی اس کی نقل بنا رہتا۔اس کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ وہ بہت جلد ہر ایک سے بے تکلف ہو جاتا تھا۔

''ارے ہاں،یاد آیا۔آج شام کو نیچے بستی میں مکھی کے لڑکے کی شادی ہے۔خاصا جشن رہے گا۔تم لوگ چلنا چاہو تو میں لے چلوں گا۔''ونود کو جیسے یاد آ گیا۔

''میں اور پریما دیدی تو ضرور ہی چلیں گے۔''راہل نے جلدی سے کہا۔

''سب سے ہی پوچھ لینا،جس کا جی چاہے چلے۔''ونود نے کہا۔

''اچھا تو چلوں۔''وہ رخصت طلب کرتے ہوئے بولا۔

''جی چاہے تو ناشتہ بھی کر سکتے ہو۔''

''جی نہیں،شکریہ۔وہاں ناشتے پر ڈیڈی انتظار کرتے ہوں گے۔''

ونود اسے خود برآمدے تک رخصت کرنے آیا اور جب راہل چلا گیا تو ونود کی توجہ رگھو کی طرف ہوئی۔وہ اپنے اکھاڑے میں اکیلا ہی ہوا سے کشتی لڑ رہا تھا۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

نشیب کا سفر

سرسری نواس کو ونود پر نہ جانے کیوں اس قدر اعتماد ہوگیا تھا کہ انھوں نے اپنی جوان لڑکیوں اور راہل کو اس کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ واپسی رات کو ہوگی۔ اور ونود کی شخصیت تھی بھی ایسی ہی۔ اس عمر میں بھی وہ کافی سنجیدہ اور پر وقار نظر آتا تھا۔ اس کا اندازِ تکلم، اس کے طور طریق سب یہ ظاہر کرتے تھے کہ وہ کسی اچھے گھرانے کا فرد ہے۔

سرسری نواس اوّل تو ایسے ہنگاموں سے دور ہی رہا کرتے تھے، دوسرے لیڈی سرسری نواس کے سر میں درد تھا۔ اس لیے بھی انھوں نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ سوشیل نے تو پہلے ہی انکار کر دیا تھا، لیکن جب ونود نے راہل سے کہا۔

''رہنے دو۔ شاید تمہاری بڑی دیدی میرے ساتھ جانا پسند نہیں کرتیں۔''

تو وہ اس کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے تیار ہوگئی۔

کار خود ونود چلا رہا تھا اور پریما پچھلی نشست پر ہونے کے باوجود آگے جھک کر اس کا دماغ چاٹے ڈال رہی تھی۔ راہل ونود کے پاس ہی اگلی نشست پر بیٹھا تھا اور اپنی عادت کے مطابق ایک ایک چیز کے بارے میں سوالات کر رہا تھا۔

''یہ درخت کس کے ہیں؟''

''وہ جھاڑی کون سے پھل پیدا کرتی ہے؟''

''یہاں خرگوش ہوتے ہیں یا نہیں؟''

''ہوتے ہیں تو ایئر گن سے مرتے ہیں یا نہیں؟''

''وہ تو ایئر گن کا نام ہی سن کر مر جاتے ہیں۔'' ونود نے تنگ آ کر جواب دیا۔

Akram Allahabadi

''لیجیے،اب آپ مذاق اڑانے لگے میرا۔'' راہل نے منہ بنالیا۔

''تم مغز جوچاٹے ڈال رہے ہوان کا۔'' پیچھے سے پریما نے اس سے چھیڑ شروع کردی۔

''اہاہا،اورتم تو جیسے منہ پر تالا ڈالے بیٹھی ہو۔'' راہل نے پلٹ کر جواب دیا۔

ونود ہنس پڑا۔

''اچھا یہ فیصلہ تمہاری سوشیل دیدی سے کراؤ کہ کون زیادہ بولتا ہے۔'' ونود نے دخل دیا۔

''ان کے حساب سے تو سب ہی زیادہ بولتے ہیں، کیونکہ وہ سب سے کم بولتی ہیں۔'' پریما نے جواب دیا۔

لیکن سوشیل کسی اورخیال میں کھوئی ہوئی تھی۔اس کی نگاہیں کھڑکی سے دور بانگڑاہل پر جمی ہوئی تھیں، جہاں بادلوں کے ابخارات دودھیا دھوئیں کی طرح چوٹی پر اورنشیب کے درختوں کی پھننگوں پر چھائے ہوئے تھے۔

شام ہورہی تھی اور سورج بانگڑاہل کی آڑ میں گم ہوگیا تھا۔تاہم آسمان ابھی روشن تھا اوردوگوالے اپنے مویشیوں کو لیے گھر لوٹ رہے تھے۔ان کے گلوں میں لٹکی ہوئی گھنٹیوں کی گونج اس پرسکون ماحول میں ایک عجیب سی موسیقی بکھیر رہی تھی۔

''تو پھر فیصلہ کس طرح ہو؟'' راہل نے پوچھا۔

''اچھا بھئی،چلو سب سے زیادہ میں بولتا ہوں، بس۔'' ونود نے حماقت اپنے سر لے لی۔پریما ہنس پڑی اور آگے کی طرف جھک گئی۔کارڈرائیو کرتے ہوئے ونود کو اس کے عنبریں بالوں گیسوؤں کی مہک ناک میں سماتی ہوئی اورایک بارہوا کے جھونکے سے اس کے بالوں کی ایک لٹ لہرا کر ونود کے رخسار سے آلگی۔اس کے سارے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی اورجس وقت پریما نے دوسرے ہاتھ سے اس لٹ کو سمیٹنا چاہا تو اس کا ہاتھ ونود کے چہرے سے

رگڑ گیا۔ایک کرنٹ کی طرح اس کے احساس میں لرزش پیدا ہوکر معدوم ہوگئی۔وہ سنبھل گیا۔ پھر بھی وہ پریما کی قربت کونظر انداز نہ کرسکا۔کوئی اور ہوتا تو اس خوش نصیبی پر رشک کرتا۔پریما ہزاروں لڑکیوں میں حسین کہی جاسکتی تھی۔کچھ دیر تک اس سے نظریں ملا لینے پر نشہ سا طاری ہونے لگتا۔لیکن ونود ایک ٹھوس کردار کا مالک تھا۔اسے اپنے جذبات پر قابو حاصل تھا۔کار چلتی رہی اور کچھ دیر کے لیے سناٹا چھا گیا۔راہل نے ان حسین قدرتی نظاروں کو دیکھنے لگا جن کی شگفتگی فطرت میں ڈھلی ہوئی زندگی کا پرتو تھی،جن کی تازگی روح کو بالیدگی بخشتی تھی۔سرسبز میدانوں اور گھاس اور جھاڑیوں سے ڈھلے ٹیلوں اور برگ وبار درختوں کے جھنڈ کے درمیان سے گزرتے وہ شہری زندگی کے غیر قدرتی اور مصنوعی ماحول کو اس طرح بھول گئے تھے، جیسے وہ اسی نئے ماحول کا ایک حصہ ہوں۔پریما کو ایسے مناظر سے گویا عشق تھا۔وہ بار بار لمبی لمبی سانسیں لے کر اس سوندھی ہوا کو سونگھنے لگتی،جس میں خودرو سبزے کی بو بھی شامل تھی اور جنگلی پھولوں اور پھلوں کی مہک بھی۔

اچانک ایک سوال نے ونود کو چونکا دیا۔سوشیل بیٹھے بیٹھے کچھ پوچھ بیٹھی تھی۔

''وہ میگھ دوت کی پہاڑی ہے نا؟''

یہ بات بہت کم لوگ ہی جانتے تھے اور ونود کو بھی یہ حقیقت اسٹیٹ کے کاغذات سے معلوم ہوئی تھی کہ بانگڑاہل کو اب سے بیس سال پہلے میگھ دوت کی پہاڑی کہا جاتا تھا اور راجا نگم نے ہی ۲۰ سال قبل اس کا نام تبدیل کر کے بانگڑاہل کردیا تھا۔تب سے چند سالوں میں ہی لوگ اس کا اصل نام بھول گئے تھے۔

''ہے تو وہی۔''ونود کے منہ سے نکلا۔

''اس کی چوٹی پر ایک مندر بھی ہے شیو جی کا۔''کھوئے ہوئے انداز میں سوشیل نے دوسرا سوال کیا اور اس بار ونود کی حیرت اور زیادہ بڑھ گئی۔

یہ مندر اب نہیں،لیکن ۲۰ سال پہلے تھا۔اسٹیٹ کے پرانے نقشے میں وہ موجود تھا۔

اور بعد کے نقشوں میں اس کا وجود نہیں تھا۔خدا جانے اس میں کون سی مصلحت تھی ۔بہر حال پاگل اپدیش نے ایک بار ایک کہانی نہ جانے کس موڈ میں اسے گا کر سنائی تھی اور اس میں اس مندر کا بھی تذکرہ تھا۔اسے غصے میں آکر راج انے منہدم کرادیا تھا۔وہ بڑا ظالم تھا۔اور تب سے اس پہاڑی پر بستی کے کسی بھی آدمی کے جانے کی سختی سے ممانعت تھی ۔یہ سب کیوں ہوا تھا، کیسے ہوا تھا،اس راز سے اگر کوئی واقف تھا تو اسٹیٹ کی بوڑھی رانی ہوگی، جو شہر میں رہتی تھی، لیکن خود بستی کے لوگوں کو بھی اس کے بارے میں کوئی صحیح معلومات نہ تھیں ۔البتہ اپدیش اس علاقے کا سب سے پرانا بوڑھا تھا اور کئی سال بیتے جب وہ اچانک پاگل ہوگیا تھا۔وہ اگر کچھ جانتا بھی رہا ہو تو یہ پاگل ہونے پر حافظہ کب قائم رہتا ہے ۔پھر بھی وہ کبھی کبھی ایک عجیب سا گیت گایا کرتا تھا۔بڑا درد بھرا گیت جس میں اس مندر کا بھی ذکر آتا ۔ظالم راجا کا بھی ذکر ہوتا اور دو دلوں کی ایک کہانی ہوتی جن کے وہ عجیب عجیب سے نام رکھا کرتا تھا اور پاگل پن میں اور نہ جانے کیا کیا بک جاتا ۔کوئی کچھ سمجھتا بھی تو نہ سمجھ پاتا ۔اسے مجذوب کی بڑ ہی سمجھ کر لوگ کوئی اہمیت نہ دیتے تھے ۔ویسے بھی وہ بستی یا آبادی میں بہت کم نظر آتا ۔وہ اپنے گھر پر ہی بیٹھ کر اپنا طنبورہ لیے ان پہاڑوں میں ہی گھومتا رہتا ۔کبھی بستی میں آنکلتا تو لوگ اس کی حرکتوں پر ہنستے بھی اور اس کی مجذوبیت سے خوف بھی کھاتے ،لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کب کہاں بھٹک رہا ہوگا اور کب کسے کہاں مل جائے گا۔

بہر حال سوشیل کی زبان سے اس قسم کے سوالات ونود کے لیے بڑے تعجب خیز تھے ۔سوشیل جو کل ہی بلدان میں آئی تھی اور جو کسی سے ملی بھی نہ تھی، اسے ایسی باتیں کیسے معلوم تھیں جو یہاں کے لوگوں کو بھی معلوم نہ تھیں ۔ونود کا ذہن اسی سوچ میں پڑ گیا ۔سوشیل اسی طرح کھوئی ہوئی بانگڑاہل کی طرف دیکھ رہی تھی ۔

''آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ وہاں ایک مندر بھی ہے؟'' ونود نے خود ہی اس سے سوال کر ڈالا۔

''مجھے ایسا لگتا ہے جیسے... جیسے میں وہاں جا چکی ہوں۔'' وہ کھوئے ہوئے انداز میں بولی۔

ونود کی عقل اور چکرا گئی۔ سرسری نواس کا خاندان پہلی بار یہاں آیا تھا اور یہ لوگ اس ماحول کے لیے قطعی نئے تھے۔

وہ کچھ کہنے ہی جا رہا تھا کہ پریما نے اپنے کان کے گرد انگلی گھما کر اسے اشارہ کیا کہ دیدی کا دماغ ایسا ہی ہے۔

ونود چپ ہو گیا۔ اس کا ذہن مطمئن نہ ہو سکا۔

سڑک کم چوڑی اور ڈھلوان تھی اور ونود اگر خیالات کی اس الجھن کے باوجود اسٹیئرنگ پر پورا کنٹرول نہ رکھتا تو ایسے موڑ بھی آئے کہ گاڑی الٹ پلٹ ہو سکتی تھی۔ پھر انھیں نشیبی آبادی کے آثار نظر آنے لگے۔ جھونپڑیوں سے دھواں نکل رہا تھا اور ڈھول پیٹے جانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ بستی میں چہل پہل نظر آتی تھی۔ مرد، عورتیں، بچے سب ہی بستی کے درمیان کے ایک فرلانگ لمبے میدان میں جمع ہوتے نظر آ رہے تھے۔ میدان میں زرد، لال، سبز اور نیلے پھریرے لہراتے نظر آ رہے تھے۔

ان پہاڑوں کے سردار کی کچی حویلی دور سے ایک سیڑھیوں والے بڑے چبوترے پر بنی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اسے پتیوں اور پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ اس بستی کے سرے پر ایک اور جھونپڑا تھا جو سجا ہوا نظر آ رہا تھا، جو شاید لڑکی والوں کا ہوگا۔

ان کی کار جب بستی میں داخل ہوئی تو لوگ چونک کر ادھر دیکھنے لگے، لیکن پریما نے دیکھا کہ ان میں سے کسی کے چہرے پر خیر مقدمی تاثرات نہیں تھے۔ وہ نفرت کی نظروں سے اس کار کو اور کار میں بیٹھے لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔ یہ بات پریما کی سمجھ میں نہ آئی۔ وہ ونود سے پوچھ بیٹھی۔

''یہ لوگ ہمیں اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں؟''

''اس لیے کہ میں اسٹیٹ کا منیجر ہوں اور یہ لوگ راجا نگم اوران کے آدمیوں سے ہمیشہ ناخوش رہے ہیں۔سنا ہے کسی بات پر راجا نے ان سے ناراض ہوکران پر بہت ظلم کیا تھا۔'' ونود نے بتایا۔

''آپ کوتمام واقعات نہیں معلوم شاید۔''

''میں نے کبھی اپنے کام سے زیادہ کسی معاملے سے دلچسپی نہیں لی۔اوراس بستی میں تو بہت کم آیاہوں آج تو میں خیر سگالی کےطور پر بن بلائے جارہاہوں۔''ونود نے بتایا۔

''اورجوان لوگوں نے بدسلوکی کی؟''

''نہیں،یہ جرأت کسی کی نہیں ہوسکتی۔کوئی زبان بھی نہیں کھولے گا۔''ونود نے کہا۔

''مجھے تو تیوراچھے نظر نہیں آرہے۔''راہل نے کہا۔''یہ تو بالکل امریکن ریڈ انڈین والا معاملہ معلوم ہوتا ہے۔''

''اونہونہہ،یہ جھگڑالو نہیں ہیں۔''ونود نے تردید کی۔

کاراب ایک چوڑی گلی سے ہوتی ہوئی میدان کا چکرکاٹ کران کے سردار کی حویلی کے سامنے رک گئی۔وہ خود بھی شورسن کر باہر نکل آیا تھا۔غروبِ آفتاب کے وقت بھی اس قدر روشنی تھی کہ شکلیں پہچانی جاسکیں۔ونودکودیکھ کروہ اس کے استقبال کے لیے آگے بڑھا،مگراس کے چہرے پر کوئی مسکراہٹ نہ تھی۔ونود نے کار سے اترتے ہوئے اندر سے ایک بڑا سا پیکٹ نکالا اورسردار کی طرف بڑھادیا۔

''سلام۔''سردار نے بھاری آواز میں ہاتھ اونچا کر کے کہا۔

''سلام۔''ونود مسکرایا۔''سوچا تمہارے بیٹے کی شادی ہے،پڑوسی کے ناطے سے تم نے نہیں پوچھا،تو ہم خود ہی شریک ہوجائیں۔''ونود نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

''ہمیں تم سے نفرت نہیں۔ہمیں تو تمہارے مالک اوراس کے خاندان سے نفرت ہے۔''سردار نے بھاری لہجے میں جواب دیا۔

Akram Allahabadi

''راجا نگم مر چکے ہیں اور رانی صاحبہ کو تم سے کوئی پرخاش نہیں۔ وہ تو یہاں رہتی بھی نہیں ہیں۔ اس لیے اب جھگڑا ختم ہو جانا چاہیے۔'' ونود بولا۔

''اس عرصے میں پریما، راہل اور سوشیل بھی گاڑی سے اتر چکے تھے۔ وہ گاڑی کے پاس ہی کھڑے ان کی باتیں سن رہے تھے۔

''جھگڑا ہم نہیں کرتے، مگر ہمارے مویشی اگر چرتے ہوئے ریاست میں پہنچ جاتے ہیں تو تمہارے کارندے ہم سے چرائی کا محصول وصول کر لیتے ہیں، ورنہ جانور ضبط کر لیتے ہیں۔'' سردار نے شکایت کی۔

یہ غلط ہے، انھیں ایسی کوئی ہدایت نہیں کی گئی۔'' ونود نے انکار کیا۔

''یہ سچ ہے اور آئے دن یہ واقعات ہوتے رہتے ہیں۔'' سردار کا لہجہ گرم ہو گیا۔

''تو یہ کارندوں کی شرارت بلکہ بے ایمانی ہے۔ میں ان سب کی خبر لوں گا۔ تم اپنی بستی میں اعلان کر دو کہ نگم اسٹیٹ میں کسی سے 'چری' نہیں لی جائے گی۔ جس کا جہاں بھی جی چاہے اپنے مویشی چرائے اور اگر کوئی کارندہ اس پر ظلم کرے تو مجھ سے شکایت کرے۔'' ونود نے جوش میں آ کر کہا اور اس کے اس اعلان پر سردار کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔

''کہا ہمارے ضبط کیے ہوئے جانور بھی واپس کیے جائیں گے؟''

''کیوں نہیں، میں کل ہی واپس کرا دوں گا۔'' ونود نے یقین دلایا۔

''تم بہت اچھی آدمی ہو، منیجر۔ تم ہمارے دوست ہو۔ میں تم سے بہت خوش ہوں۔'' سردار، ونود کی پیٹھ ٹھونکنے لگا۔ پھر اس نے آدمیوں کی طرف رخ کر کے کچھ چلا کر کہا، جو اس کی اپنی پہاڑی زبان تھی اور یہ لوگ اس کا ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکے، لیکن اندازہ یہی ہوا کہ وہ ونود کے اعلان کی خوش خبری ساری بستی میں پہنچوانے کی ہدایت کر رہا ہے۔ اس کے الفاظ کو سنتے ہی لوگ خوش ہو گئے۔ وہ اتنے سادہ لوح تھے کہ اتنی سی بات نے ان کے چہروں سے نا خوشگواری کے تاثرات مٹا دیے اور انھوں نے چاروں طرف سے جمع ہو کر ونود کی کار کو اور ونود کو

گھیر لیا۔ان میں سے کچھ اس کی طرف مٹی کے پیالے ہاتھوں میں لیے بڑھے، جن میں مہوے کی شراب تھی۔یہ دوستی اور مہمان نوازی کی علامت تھی،لیکن ونود نے ہنس کر سر ہلا دیا۔

''نہیں، میں نشے کی کوئی چیز نہیں چھوتا۔''اس نے سردار سے کہا اور سردار نے ان لوگوں کو پیالے ہٹانے کا اشارہ کر دیا۔

میدان میں جہاں سردار اور اس کے لڑکے کے لیے پنڈال لگایا گیا تھا، وہیں فوراً ان چار مہمانوں کے لیے نشستیں لگا دی گئیں۔

دن ڈھلتے ہی یہاں کی رسومات شروع ہو گئیں۔سردار ایک سرخ کارچوبی قبا پہنے اور سر پر مور کے پیروں والی ایک لمبی ٹوپی لگائے جب پنڈال میں آیا تو میدان بستی والوں سے کھچا کھچ بھر چکا تھا اور بستی کی ہر گلی میں ڈھول زور زور سے پیٹے جا رہے تھے۔شاید ان کی شادی کی خوشی منانے کا یہی رواج تھا، یا محض اس لیے اس قدر جوش و خروش ہو کہ شادی ان کے سردار کے لڑکے کی تھی۔مغرب ہوتے ہی ساری بستی مشعلوں سے جگمگا اٹھی۔میدان میں لوگ پنڈال کو چھوڑ کر درمیان ہی میں ایک خالی گھیرا چھوڑتے ہوئے پیچھے ہٹ کر بیٹھ گئے۔دلہن کو اس کے قبیلے کی چند عورتیں، جو اپنی تہذیب کے مطابق نیم عریاں لباس میں تھیں اور خود بھی ہار پہنے ہوئے تھیں، سردار کے سامنے لائیں۔اس وقت بیل کے سینگوں والے قرنے پھونکے جانے لگے اور ڈھول زور سے پیٹے گئے۔

سردار کے سامنے لکڑیوں کے ایک چھوٹے سے ڈھیر پر کوئی خوشبودار تیل چھڑکا گیا اور ایک مشعل سے اس میں آگ لگا دی گئی۔اس وقت سردار کے دائیں سمت بیٹھا ہوا ایک بڑی سی الجھی ہوئی داڑھی والا آدمی، جو کوئی کاہن یا پجاری معلوم ہوتا تھا، آگے بڑھا اور اس نے زمین کی دھول اٹھا کر اس پر کچھ پڑھ پڑھ کر آگ پر پھینکنا شروع کیا۔

''یہ تو کوئی جادوگر جیسے منتر پڑھ رہا ہے۔''راہل سے بولے بغیر نہ رہا گیا۔

''ہر علاقے اور ہر عقیدے کے لوگوں کے اپنے اپنے رواج ہیں۔''ونود نے اسے

سمجھایا۔

''یہ عورتیں جھوم کیوں رہی ہیں؟'' پریما نے ہار پہنے عورتوں کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ کنواریاں ہیں۔ جب کسی کی شادی ہوتی ہے تو باقی لڑکیاں کام دیو کو منانے کی خاطر مہوے کی شراب پی کر جھومتی ہیں تا کہ ان کی بھی باری آجائے۔'' سردار نے پریما کا سوال سننے کے بعد خود بتایا۔

''آپ تو ہندوستانی زبان بولتے ہیں؟'' راہل نے اس سے سوال کیا۔

''ہندوستانی تو سب ہی ہیں، لیکن یہ لوگ کیونکہ شہر جا کر بھی شہریوں سے کم مانوس ہوتے ہیں، اس لیے ان کی زبان سمجھ تو لیتے ہیں، پوری طرح یا صاف بول نہیں سکتے۔ اور مجھے تو میرے باپ نے خاص طور پر شہر بھیج کر ایک اسکول میں پڑھوایا تھا، اس لیے میں بول بھی سکتا ہوں اور لکھ بھی سکتا ہوں۔'' سردار نے بڑی نرمی سے بتلایا۔

''لیکن شکل اور لباس سے آپ ایسے کیوں نظر آتے ہیں؟'' راہل نے گویا بحث چھیڑ دی۔

''میں ان کا سردار ہوں اور مجھے ان کے رسم و رواج اور طور طریق سے ہی رہنا ہے، ویسے بھی میں اپنے اس ماحول میں جس قدر خوش ہوں، شہر میں رہ کر کبھی اتنا خوش نہیں رہتا۔'' سردار نے کہا۔ ''میرا لڑکا بھی، جس کی شادی ہو رہی ہے، شہر میں سات کلاس پڑھ چکا ہے۔ ہمارے یہاں اتنی تعلیم قابلِ فخر سمجھی جاتی ہے۔'' سردار نے کہا۔

''تو آپ اسکول یہاں کیوں نہیں کھلوا دیتے؟''

''کوئی کم بخت پڑھنے نہیں آتا، سب ڈرتے ہیں۔ میرے بیٹے نے خود انھیں پڑھانے کی کوشش کی تھی۔'' سردار نے دولہا کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔

اتنے میں دلھن کو دولھا کے قدموں میں جھکا دیا گیا۔ رواج کے مطابق دولھا نے اسے ٹھوکر ماردی اور وہ الٹ گئی، مگر پھر اٹھ کر اس کے قدموں میں جھکنے پر دولھا نے اسے

Akram Allahabadi

بازوؤں سے تھام کر اٹھالیا اور اپنے گلے کا ہار اتار کر اس کے گلے میں ڈال دیا۔ پھر دولھا دلھن پاس پاس بیٹھ گئے اور میدان میں مشعلوں کا رقص جنوں شروع ہوگیا۔ ڈھول پر تھاپ پڑتی گئی اور لوگ رقص میں شامل ہوتے گئے۔ ڈھولوں کی 'دھمڑ دھم' زمین کو دہلانے لگی۔ سردار کی طرف سے اس وقت مہمانوں کی خدمت میں مسمبی اور سنگترے کے رس والے گلاس پیش کیے گئے۔ راہل کو تو اس رقص میں بڑا لطف آرہا تھا۔ اس نے اس قسم کی زندگی کی کہانیاں سنی تھیں، یا کتابوں میں پڑھی تھیں، لیکن آج اپنی آنکھوں سے دیکھ کر وہ بہت خوش ہو رہا تھا۔ اس معصومانہ آزاد زندگی میں بڑی سادگی، بڑی تڑپ تھی۔ شہریوں کی مصروف زندگی کی فریب کاریوں سے دور حسنِ فطرت کی آغوش میں پلتے ہوئے ان سادہ لوح انسانوں کو اپنی ضروریاتِ زندگی سے زیادہ کسی چیز کی فکر نہ تھی۔ وہ جفاکش تھے۔ اپنی روزی آپ کماتے تھے اور جو کچھ آپ حاصل کر پاتے تھے، اسی میں خوش رہتے تھے۔ فکرِ فردا کو وہ تقدیر کے حوالے کر دیتے تھے اور اپنے آج میں مست رہتے تھے۔ رقص اور ڈھول کا شور اپنے نقطۂ عروج پر تھا۔ جب اچانک لوگوں کے ہاتھ رک گئے۔ سارا شور اچانک بند ہوگیا۔ اور ونود، راہل اور پریما حیران ہو کر ادھر دیکھنے لگے۔

تمام لوگ ساکت و سامت کھڑے کسی طرف کان لگائے ہوئے تھے۔ اور اس وقت ونود نے وہ آواز سنی۔ وہ پہاڑوں میں پھیلی ہوئی ایک بانسری کی تان کی گونج، جو وجد آفریں تھی، جس میں سحر جیسی تاثیر تھی، جو دلوں کو تڑپا دیتی، لیکن اس کی سب سے حیرتناک خصوصیت یہ تھی کہ وہ ان خاموش پہاڑیوں کے سناٹے میں ہر طرف گونجتی سنائی دیتی۔ کبھی تیز اور اس قدر تیز جیسے کوئی سامنے سے بانسری بجاتا گزر گیا ہو اور کبھی اتنی دور جیسے میلوں کا فاصلہ درمیان میں حائل ہو۔

☆☆☆☆☆☆

بھٹکتی روح

ان لوگوں نے اس وقت بانگڑاہل کی طرف اپنے اپنے رخ کر کے سر جھکا دیے۔

''یوجنا کی روح بھٹک رہی ہے ان پہاڑوں میں۔'' سردار نے ونود کی حیرت رفع کرنے کے لیے کہا۔

''یہ بات میں اکثر سن چکا ہوں، لیکن یہ ہے کیا واقعہ؟ یوجنا کی روح کیا چیز ہے؟'' ونود نے سردار سے پوچھا۔

''وہ ہم میں سے ہی ایک تھا، لیکن وہ ایک جادوگر تھا جس کی بانسری کی تان پر ہمارے مویشی بھی دم بخود رہ جاتے تھے۔ میں ان دنوں جوان تھا۔ میں نے خود دیکھا ہے۔ میں نے خود اس کی بانسری پر سر دھنا ہے۔'' سردار نے بتایا۔

''لیکن اس کی روح کیوں بھٹک رہی ہے؟''

''کسی کی تلاش میں۔ اپدیش یہی کہتا ہے اور وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ اس سے زیادہ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔''

''اپدیش کی وہ کہانی میں نے بھی سنی ہیں، مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔'' ونود نے کہا۔

''اس کی باتیں آسانی سے سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ وہ مردِ خدا رسیدہ اور مجذوب ہے۔'' سردار نے کہا اور راہل اور پریما ہمہ تن گوش ہو کر سنتے رہے۔

بات ہو رہی تھی کہ ایک طنبورے کی آواز نے انھیں تاریکی کی طرف سے سنائی دی۔ پھر گدھے پر بیٹھا اپدیش کا سایہ نظر آیا اور لوگ ادب سے، خوف سے، ادھر ادھر منتشر ہو کر اسے راستہ دینے لگے۔ آج وہ اپنی چونچ دار لمبی ٹوپی کی چوٹی پر گل رے کا ایک گچھا لگائے ہوئے تھا

Akram Allahabadi

اور انداز بھی کچھ شاہانہ ہی نظر آ رہا تھے۔

اسے دیکھ کر گھاسی چمار جو بستی میں جادوگر مشہور تھا، ہاتھ میں کسی بھینس کی ہڈی لیے آ پہنچا اور دور سے ہی اسے للکارا۔

''کھبر دار، جبر بھوت، وہیں رک جاؤ، نہیں تو منتر مار کے بھسم کر دونگا۔تم نے اس بڈھے کے سر پر بیٹھ کر اسے پاگل بنا رکھا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ ماش کے کچھ دانوں پر منہ ہی منہ میں کچھ منتر تیزی سے پڑھنے لگا۔

''جے کالی، کلکتہ والی، تیرا وار نہ جائے خالی۔یہ بھوت ہے، سالا موالی، اس کو کھاؤں، اس کے باپ کو کھاؤں۔دھینگو ابوم چک چکا چک چم چون چائیں چائے چم چم چم ہیا ہویا ہیا ہویا ہیا ہویا...''

بستی کے سادہ لوح لوگ گھاسی چمار کی اس جادوگری کو بڑی سنجیدگی، حیرت اور عقیدت سے دیکھ رہے تھے، مگر اپدیش، گھاسی چمار کو اس طرح گھور رہا تھا جیسے اسے کوئی عجیب الخلقت جانور سمجھ رہا ہو۔پھر وہ ہنس دیا اور آگے بڑھنے لگا۔لوگ ادھر ادھر منتشر ہو کر اور ان دونوں کو درمیان میں لے کر یہ عجیب و غریب جادو منتر کی لڑائی دیکھنے لگے۔

''چمار زادے جب عقل کی بات کریں تو سمجھو کہ تمہارے پڑوسی کی بلی نے انڈے دیے ہیں، یا تم بیوی کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہو، لیکن اس سور کو نہ بھولنا جس نے ایک کسان کا ہرا بھرا کھیت اجاڑ کر پھینکا تھا۔'' اپدیش نے گھاسی چمار کی طرف دیکھے بغیر بڑبڑاتے ہوئے کہا۔جس پر گھاسی کے منتر اور زور پکڑ گئے۔وہ اس پر ماش کے دانے مار مار کر چھو چھو کرتا ہوا اچھلنے لگا۔اپدیش نے بھی اسی کی طرح منہ بنا کر گدھے پر اچھلنا شروع کر دیا۔بعض لوگوں کی ہنسی چھوٹ گئی اور بعض ڈر گئے۔اپدیش گدھے پر سے اتر پڑا اور طنبورہ لے کر ناچنے لگا۔

''اب آیا نا، بیٹا، چکر میں۔'' گھاسی نے فاتحانہ نعرہ مارا، لیکن دوسرے لمحے اپدیش کا طنبورہ اس کے سر پر پڑا اور وہ 'ہپارے' چیختا ہوا پیچھے کی طرف بھاگا۔اپدیش نے قہقہہ مارا

اور اپنے گدھے کی طرف دیکھ کر بولا۔

''ساب گدھے ہیں۔ یہ سب گدھے ہیں۔ یہ کیا جانیں پہاڑ کیوں گونجتے ہیں؟ ہوائیں کیوں چیختی ہیں؟ الو کیوں بولتے ہیں؟ اپدیش، یہ کیا سمجھیں گے تیری باتیں۔ تو چل کہیں اور انڈے دے۔ روح تڑپتی رہے گی جب تک بچھڑوں کا ملاپ نہ ہو جائے۔'' یہ کہہ کر اس نے گدھے کی لگام تھامی اور ان کے درمیان سے گزرتا آگے چلنے لگا۔ اس وقت کچھ لوگ اس کے لیے کھانا لے آئے، کوئی پانی کا برتن لے کر آ پہنچا، مگر وہ ان چیزوں کو دیکھ کر ہنس پڑا۔

''مجھے رشوت دیتے ہو کہ چپ رہوں۔ میری زبان وقت کے ساتھ ہی بند ہو گی۔ میں اپدیش ہوں جس نے کانے دیو کی آنکھ پھوڑ کر رام چرن کی بکری کو آزاد کرا دیا تھا۔ ارے جاؤ، ہاں میں سب کا باپ ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے آشیرواد دینے والے انداز میں اپنا طنبورے والا ہاتھ اٹھایا اور گدھے کے سر پر دوسرا ہاتھ پھیر کر کہنے لگا۔

''راجا گدھے چرن، تم بھی آشیرواد دے دو الو کے پٹھوں کو۔''

گدھا خدا جانے اس کے اشارے سمجھتا تھا یا اس کی زبان، اس نے منہ آسمان کی طرف کر کے، 'ڈھینچو ڈھینچو...'، چیخنا شروع کر دیا اور راہل اور پریما کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔

''کیا یہ ہمیشہ سے پاگل ہے؟'' پریما نے براہِ راست سردار سے پوچھا۔

''نہیں، یہ شاید ۲۰۔۲۲ سال سے پاگل ہوا ہے۔ میں ان دنوں جوان تھا اور مجھے اتنا یاد ہے کہ ایک رات اچانک اس کا جوان بیٹا گم ہو گیا تھا، تب ہی یہ اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے پاگل ہو گیا۔'' سردار نے کہا۔

''تو پھر نہیں ملا اس کا لڑکا؟'' راہل نے پوچھا۔

''پہاڑی پر اس کی لاش ملی تھی، خون میں لتھڑی ہوئی۔ اس کو دیکھ کر ہی اس کا دماغ بالکل چل گیا تھا۔'' سردار نے بتایا۔

بے چارا۔'' پریما اظہارِ افسوس کرنے لگی۔

Akram Allahabadi

اسی وقت اچانک دور کہیں سنائی دیتی بانسری کی وہ پراسرار آواز بتدریج تیز ہوتی ہوئی اتنی صاف سنائی دینے لگی، جیسے کوئی بڑے مدھ سُر میں بانسری بجاتا قریب سے گزر رہا ہو، یا جیسے اس کی آواز ہوا کے پردے پر لہراتی ہوئی اڑی چلی جا رہی ہو۔ وہ سکتے کے عالم میں اس پراسرار گونج کو سنتے رہ گئے، جیسے کسی کو ہوش نہ ہو۔ ماحول پر ایک بھیانک سکوت طاری ہوگیا۔ اور دور ہوتی آواز کے ساتھ ان کی نظریں اسی سمت خلاء میں بھٹکتی چلی گئی۔ کوئی گزرا ضرور تھا ادھر سے، ہوا کی طرح، لیکن کسی کو نظر نہیں آیا۔ وہ ایک بھٹکتی روح تھی جس کے تصور سے ہی ان کے دل سہم گئے۔ خاموشی کا یہ قفل اس وقت ٹوٹا جب راہل کی آواز ونود کے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''دیدی کہاں گئیں، چھوٹی دیدی؟''

پریما بھی چاروں طرف دیکھنے لگی اور ونود بھی حیران سا اس تلاش میں شامل ہوگیا۔ سردار کو معلوم ہوا تو وہ بھی ڈھونڈنے لگا اور اس نے اپنے آدمی بھی بکھیر دیے۔ سب کو یہی گمان تھا کہ کہیں اس شور سے پریشان ہوکر بستی کے پیچھے وادی کی طرف نکل گئی ہوگی۔ حالانکہ وہ مقام رات کے لیے مخدوش تھا۔ چاند اب نکل آیا تھا اور چاندنی چھٹکی ہوئی تھی، اس لیے بہر صورت اسی خیال کو تقویت پہنچی۔

ونود تقریباً حواس باختہ ہوگیا تھا، کیونکہ ذمے داری اسی کی تھی، اسی کے بھروسے پر سر سری نواس نے اپنی بیٹیوں کو بھیجا تھا۔ وہ انھیں کیا جواب دے گا۔

''کسی طرح بھی انھیں تلاش کراؤ، سردار، ورنہ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہ جاؤں گا۔'' اس نے سردار سے درخواست کی۔

''گھبراؤ نہیں، ہم اس لڑکی کو پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔'' سردار نے اسے اطمینان دلایا۔

چاندنی کے باوجود مشعلیں لیے سردار کے آدمی بستی کے پیچھے اس چھتر ے جنگل

میں گھس پڑے جو آگے جا کر گھنا ہوتے ہوتے مغرب میں بانگڑا ہل سے جا ملا تھا۔ یہ وادی کسی زمانے میں خوفناک درندوں سے بھری ہوئی تھی، لیکن بستی کی آبادی بڑھنے کی وجہ سے ان درندوں کو یا تو مار ڈالا گیا، یا وہ خشک نالوں کے ذریعے پہاڑی کی دوسری سمت کے جنگل میں نکل گئے۔ پھر بھی بھیڑیے اور لکڑ بھگے اس جنگل میں موجود تھے اور کبھی کبھی بستی والوں کے جانور اٹھا لے جاتے تھے۔ البتہ کچھ دنوں سے سنا جا رہا تھا کہ ایک شیر بھی آ گیا ہے اور وادی میں ندی کے کنارے ایک بار پانی پیتے اسے دیکھا بھی گیا ہے۔ اسی احتیاط کی خاطر لوگ مشعلیں لے کر چلے تھے اور ویسے بھی تاریک جھاڑیوں یا درختوں کے سائے تلے روشنی کی ضرورت تو تھی ہی۔

اور اس تلاش سے دور، وادی میں گونجتی ہوئی بانسری کی آواز کی طرف وہ بے تحاشا دوڑی چلی جا رہی تھی، جیسے اپنے آپے میں نہ ہو، جیسے کوئی پراسرار اور نامعلوم کشش اسے کھینچے لیے جا رہی ہو۔ اس کے قدم ناہموار راستے کے گڈھوں میں پڑ جاتے، مگر وہ گرتے گرتے سنبھل جاتی اور دوڑنے لگتی۔ بانسری کی آواز لہراتی ہوئی اس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی اور آنکھیں جیسے دھنس گئی ہوں، دماغ جیسے ماؤف ہو گیا ہو۔ بانسری کی آواز اب بانگڑا ہل کے دامن سے سنائی دینے لگی۔ اور اس کے قدم اور تیز ہو گئے، لیکن شاید قدرت کو اس اسرار سے نقاب اٹھانا ابھی منظور نہ تھا۔ اس لیے ایک جگہ اچانک اس کا پیر ایک گڑھے میں پڑ گیا اور وہ اوندھے منہ سامنے اٹھی ہوئی ایک چٹان پر اس زور سے گری کہ اس کی پیشانی خون سے داغدار ہو گئی اور تاریکی کی چادر اس کے ذہن پر اس طرح پھیل گئی جیسے زندگی کا شعور ظلمات کے عمق میں ڈوب گیا ہو۔

مشعلوں کی روشنی اس انسانی سائے پر پڑتے ہی سردار کے آدمی چونک پڑے اور جب انھوں نے اس کے قریب جا کر دیکھا تو وہ سوشیل ہی تھی، جو بے ہوش پڑی تھی اور اس کے سر سے بہتے ہوئے خون کی چادر چہرے پر پھیل گئی تھی۔ ان میں سے ایک عقلمند کی ہدایت پر ایک

تگڑے سے پہاڑی نے بے ہوش سوشیل کو اپنے کندھے پر اٹھالیا اور وہ بڑی تیزی سے بستی کی طرف لوٹ چلے۔ بستی کے سرے پر ہی انھیں سردار مل گیا، اس کے ساتھ راہل بھی تھا جو بہن کو اس عالم میں دیکھتے ہی چیخ کر دوڑا، لیکن سردار نے سوشیل کو دیکھ کر اسے اطمینان دلایا کہ صرف سر میں چوٹ لگی ہے، گھبرانے کی ضرورت نہیں۔"

کچھ دیر بعد ہی خبر پا کر ونود اور پریما بھی آپہنچے۔ پریما اس کے ساتھ ہی تلاش میں لگی رہی تھی اور اس بھاگ دوڑ میں کئی موقعے ایسے بھی آئے جب وہ ایک دوسرے سے ٹکرا گئے تھے۔

خدا جانے اس وقت ونود نے کیا کچھ محسوس کیا ہو، لیکن پریما اس کے قریب میں ضرور اپنے اندر ایک خاص تبدیلی محسوس کر رہی تھی، جیسے وہ اس کی طرف کھنچی جا رہی ہو۔ کبھی کبھی تو اس کا جی چاہتا کہ اس کے مضبوط بازوؤں میں اس طرح سمٹ جائے کہ اس کا وجود اس کا اپنا نہ رہے۔ نہ جانے کیوں اسے ایسا لگتا تھا جیسے وہ ونود کی اور اس کی ملاقات نئی نہ ہو، جیسے وہ برسوں سے اسے جانتی ہو، اس کے قریب رہی ہو۔

ونود بہرصورت اس ذمے داری کے لیے پریشان تھا جو سوشیل کی اچانک گمشدگی سے اس کے سر پر آپڑی تھی۔ اس کی بھروسے پر ان لوگوں کو سرسری نواس نے بھیجا تھا۔

سوشیل کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر سرخی کی لہر دوڑ گئی۔ اس وقت اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی جا رہی تھی اور سردار نے اپنی کوئی عطائی دوا، جو یہاں کی پہاڑی بوٹیوں سے زخم وغیرہ کے لیے تیار کی جاتی تھی، اس کے سر کے زخم کو صاف کر کے بھر دی تھی۔

کچھ دیر میں ہی سوشیل نے کسمسا کر آنکھیں کھولیں اور حیرت سے سب کی شکلیں دیکھنے لگی۔

"آپ کہاں چلی گئی تھیں؟" ونود نے اس کے قریب ہو کر پوچھا۔

"کہاں؟ میں کہیں گئی تھی؟" سوشیل نے حیران ہو کر خود سوال کیا۔

Akram Allahabadi

''یہ لیجیے، یہاں تو درجنوں آدمی آپ کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ خود میں، راہل، پریما اور سردار بھی بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔''ونود نے بتایا۔

''مم...مگر میں تو کہیں نہیں گئی۔''تذبذب کے عالم میں سوشیل نے جواب دیا۔

اس پر اشارے سے سردار نے ونود کو ایک طرف بلا لیا اور راہل اور پریما سوشیل کی مزاج پرسی کرنے لگے۔

''ایسی بھی ایک بیماری ہوتی ہے۔بعض لوگ بیٹھے بیٹھے سو جاتے ہیں اور سوتے میں چلنے لگتے ہیں۔''سردار نے بتایا۔

''ہاں، ایسی بیماری ہوتی تو ہے، مگر ان کے بارے میں تو میں نے نہیں سنا ایسا۔'' ونود نے کہا۔

''مجھے یہ شکل کچھ پہچانی پہچانی سی لگ رہی ہے۔عجیب سی بات ہے۔''سردار یہ کہہ کر خود اچنبھے میں کھو گیا۔

''کیا عجیب سی بات ہے؟''ونود نے پوچھا۔

''ان کی شکل بالکل اس راج کماری سے ملتی ہے۔''

''کون راج کماری؟''

''راجا نگم کی بیٹی۔ممکن ہے یہ اتفاق ہی ہو، مگر اپنی یادداشت کے بھروسے پر ہی میں یہ ضرور کہوں گا کہ بالکل وہی شکل ہے۔''

''اگر ہو بھی تو کیا ہوا؟''

''خدا جانے، مگر ایک عجیب سا خیال میرے ذہن میں پیدا ہو رہا ہے۔''

''سردار، پہیلیاں نہ پوچھو، ہمیں واپس بھی جانا ہے۔''

''تم نے یوجنا کا نام سنا ہے؟''

''ہاں، کوئی کہتا ہے شاید...''

Akram Allahabadi

''کہانی نہیں، حقیقت، بیس سال پہلے کی ۔یہ راز صرف تمہیں بتاتا ہوں ۔راج انگم اس لیے میرا دشمن ہوگیا تھا۔'' یہ کہہ کر وہ ٹہلتا ہوا ونود کو دور لیتا چلا گیا۔یہاں تک کہ وہ تنہا ایک درخت کے نیچے آ کھڑے ہوئے ۔

''یوجنا..اپدیش کا بیٹا تھا۔میں جوانی کے دنوں میں خود اس کی بانسری کی آواز سننے کے لیے پاگل رہا کرتا تھا۔اور راج کماری، وہ راجا نگم کی بیٹی تھی ۔ان دونوں کو ایک دوسرے سے عشق ہوگیا تھا۔عشق سمجھتے ہو نا؟''

''ہاں ہاں، میں دودھ پیتا بچہ نہیں ہوں ۔''ونود ہنس پڑا۔

''نہیں، تم کیا سمجھو گے۔اسے وہی سمجھ سکتے ہیں جنہوں نے عشق کیا ہے ۔آدمی اس کے لیے ہنستے ہنستے جان دے دیتا ہے۔'' سردار کا لہجہ یہ کہتے ہوئے جوشیلا ہوگیا۔ونود کی مسکراہٹ اور گہری ہوگئی۔

''معلوم ہوتا ہے تم اس منزل سے گزر چکے ہو۔''

''ہاں۔ میں جانتا ہوں یہ کتنی بُری بلا ہے۔خیر چھوڑو، ہاں تو راج کماری کو یوجنا سے عشق ہوگیا تھا۔وہ اس کی بانسری کی آواز پر پاگل ہوا اٹھتی تھی اور راجا نگم کو جب معلوم ہوا تو اس نے...'' اس نے یہ کہہ کر اس نے سرگوشی کا لہجہ اختیار کر لیا اور ونود کے کان کے پاس منہ لگا کر کہا۔''اس نے یوجنا کو قتل کرا دیا۔''

''قتل کرا دیا؟''ونود چونک پڑا۔

''ہاں۔لیکن یہ راز میں جانتا ہوں یا اپدیش اور کسی کو معلوم نہیں اور یہ بانسری کی آواز جو پہاڑوں میں گونجتی سنائی دیتی ہے، یہ اسی کی بانسری کی آواز ہے۔یوجنا کی روح آج تک ان پہاڑوں میں بھٹکتی پھر رہی ہے۔''

سردار نے کچھ اس انداز سے اس کا ذکر کیا کہ ونود کے دل پر اس پراسرار روح کی ایک نامعلوم سی دہشت طاری ہوگئی۔اس نے کوئی اور سوال نہیں کیا۔وقت بھی کافی ہو چکا تھا۔

Akram Allahabadi

اس نے ان سب کو اپنی کار میں بٹھایا اور سردار سے رخصت ہو کر روانہ ہو گیا۔ اس وقت اس کے ذہن میں عجیب عجیب سے خیالات بسے ہوئے تھے۔ راج کماری سے سوشیل کی مشابہت، یوجنا کی داستان اور اس کی بھٹکتی روح کا پراسرار وجود ذہن تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا، لیکن واقعات کا یہ سلسلہ اگر اسی طرح تھا تو اس کے پسِ پردہ کوئی بات ضرور تھی۔ سوشیل راستے بھر گم سی رہی۔ پریما نے ونود سے کئی سوالات کیے، لیکن اس کا ذہن اس قدر الجھا ہوا تھا کہ اس نے ہونہہ... ہاں... سے زیادہ جوابات ہی نہ دیے۔ کار جب واپس شانتی کنج پر پہنچی تو سرسری نواس اور ان کی بیوی بے قراری سے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ سوشیل کے سر پر پٹی دیکھتے ہی لیڈی سری نواس پریشان ہو گئیں۔ انھوں نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

ونود نے سب سے پہلے سوشیل کو مشورہ دیا کہ وہ سر کے زخم کی وجہ سے جا کر آرام کرے اور سرسری نواس نے بھی اس کی تائید کی۔ سوشیل خاموشی سے اٹھ کر چلی گئی۔ پریما اور راہل کی موجودگی میں ونود انھیں اتنا ہی بتا سکا، جس قدر راہل پریما بتا سکتے تھے۔ بات ان لوگوں کی سمجھ میں بھی نہ آئی اور سرسری نواس بھی اس سوچ میں پڑ گئے کہ کہیں سوشیل کو خواب میں چلنے کی بیماری تو نہیں ہو گئی ہے۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

آزمائشی لمحات

شانتی کنج سے واپسی پر اس رات ونود کو بہت دیر سے نیند آئی۔ نہ جانے کیوں سوشیل کے بارے میں ہی سوچتا رہا۔ کبھی کبھی پریما کا تصور آجاتا تو اسے جھرجھری سی آجاتی۔ وہ لمحات بھی کس قدر خطرناک گزرے تھے جب اگر وہ اپنے آپ کو نہ سنبھال لیتا تو...؟ رات کیونکہ وہ دیر سے لوٹا تھا، اس لیے کار ساتھ لیتا آیا تھا۔ ڈرائیور اکبر خاں وقت کا بڑا پابند تھا، چاہے کچھ ہو جائے، لیکن اپنی ڈیوٹی کے اوقات ختم کرتے ہی وہ گاڑی چھوڑ کر چل دیتا تھا۔ بہرحال ویسے بھی سرسری نواس کے خاندان کو آدھی رات میں کسی کار کی ضرورت تو محسوس نہ ہوتی۔

اس کی پلک جھپکی ہی تھی کان کھڑے ہو گئے۔ اس وقت ساڑھے ۱۲ بج چکے تھے۔ وہ آواز یقیناً اس بانسری کی تھی۔ مدھم سی، سریلی، بہت دور۔ شاید بانگڑاہل کی بلندیوں پر۔ لیکن نہ جانے کیوں اس کا دل چاہا کہ وہ باہر نکل کر دیکھے۔ سردی کافی تھی اور ٹھنڈی تم ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ اس نے اپنا اوورکوٹ پہنا اور جوتے پیروں میں ڈال کر باہر نکل آیا۔ برآمدے میں کھڑے ہو کر اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ کائنات چاند کی ٹھنڈی سنہری روشنی میں نہائی ہوئی تھی اور درخت پہاڑ چٹانیں سب سو رہے تھے۔ بڑا فرحت بخش سماں تھا۔ اس نے ناک سکوڑ کر لمبی لمبی خوشگوار سانسیں لیں اور اس کا جی چاہنے لگا کہ قدرت کے ان حسین اور تازگی کے بخش نظاروں میں اس طرح کھو کر رہ جائے، جیسے وہ خود ان کا ایک عنصر ہو اور کاش یہ سرور رومان انگیز زرد چاندنی کائنات پر اسی طرح چھائی رہے۔ درخت، ندی، پہاڑ، وادیاں اور چٹانیں اسی طرح سوئی رہیں۔ ہواؤں کے دوش پر ابدی سکون و مسرت سے سرشار سبک سا روحوں کے قافلے بہتے رہیں۔

بانسری کی وہ پراسرار گونج اب مدھم پڑ گئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا شانتی کنج کی

طرف چلنے لگا۔ نہ جانے کیوں اسے بار بار سوشیل کا خیال آرہا تھا۔ اتنی حسین، سنجیدہ اور باوقار لڑکی اور... لیکن آخر اسے ہو کیا گیا تھا؟ کیا اب ہو سکتا ہے کہ... مگر نہیں، یہ سب فضول باتیں ہیں۔ تو ہم پرستی کے دور کی۔

چلتے چلتے اسے ایک ٹھوکر لگی اور وہ پیر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ زمین سے ابھرا ہوا ایک پتھر اس کے راستے میں آ گیا تھا۔

وہ اب آہستہ چلتا شانتی کنج کی سمت کا ڈھلوان اترنے لگا۔ اچانک اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کسی بھیڑیے کی دو خوفناک آنکھیں ہی اسے ایک چھوٹی سی جھاڑی کی آڑ سے گھور رہی تھیں۔ اور وہ آدھی رات کو بغیر کسی ہتھیار کے ہی گھر سے باہر نکل آیا تھا۔ اس نے بہرصورت جی کڑا کر کے زمین سے دو وزنی پتھر اٹھا کر دونوں مٹھیوں میں دبا لیے، لیکن قریب پہنچنے پر اسے کچھ بھی نظر نہ آیا۔ وہ اسے اپنا وہم سمجھ کر مسکرا دیا۔

شانتی کنج اب سامنے نظر آ رہا تھا۔ سویا ہوا تاریک شانتی کنج، جس کے برآمدے پر عشقِ پیچاں کی بیل لٹک رہی تھی اور کریم کے درختوں کی باڑھ نے جس کے گرد احاطہ باندھ رکھا تھا۔ اس کے چھوٹے سے بغیچے میں کھلے ہوئے پھول اس کھلی فضا میں اتنے مہک رہے تھے کہ ان کی بو ونود کے شامہ سے بھی ٹکرائی۔ تیسری بار وہ اچھل کر ہٹ گیا اور اس کا دل دھڑک اٹھا۔ اگر کوئی چھٹی حس اسے اچھل پڑنے پر مجبور نہ کر دیتی تو اس کا پیر اس سیاہ سانپ پر ضرور پڑ گیا ہوتا جو بلا خوف و جھجک اس کے سامنے سے گزر کر سرسراتا ہوا دوسری طرف گیا تھا۔ وہ اس اتفاق پر دم بخود سا وہیں کھڑا رہ گیا۔ اور سانپ سبز گھاس میں غائب ہو گیا۔

ایک بار اس نے سوچا، شاید قدرت اس کی راہ میں رکاوٹیں ڈال رہی ہے، لیکن پھر اس کی ضد غالب آ گئی۔ وہ آگے بڑھتا گیا۔

لیکن شانتی کنج کے نزدیک پہنچ کر اس کا دل آپ سے آپ دھڑکنے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے بانسری کی وہ پراسرار گونج شانتی کنج کا طواف کر رہی ہو۔ وہ ٹھٹک کر رک گیا۔

مدھم چاندنی میں عمارت اداس معلوم ہو رہی تھی۔اور ہر طرف بھیانک سکوت طاری تھا، سوائے بانسری کی گونج کے۔اسی وقت اس نے کچھ اور عجیب سی بات دیکھی۔اسے بغیچے کے ایک امرود کے درخت کی ڈالی زور زور سے جھولتی نظر آئی۔نہ تو ہوا اتنی زور کی تھی اور نہ اس ڈالی پر اسے کوئی جانور بیٹھا نظر آیا۔ہوا بھی ہوتی تب بھی وہ ڈالی اتنی نہ جھولتی۔

کچھ دیر بعد وہ ساکن ہو گئی۔ونود اب کریٹم کی باڑھ تک پہنچ چکا تھا۔دوسری سمت مقابل پیڑ کے سائے میں تاریکی تھی اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، جب اس نے اس تاریکی سے ایک سائے کو پیدا ہوتے دیکھا۔ایک مدھم سفید انسانی سایہ۔وہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا، مگر جیسے کوئی چیز اس کے منہ سے لگی تھی۔شاید بانسری ہی ہو۔کیونکہ بانسری کے مدھم سر اس کے کان سن رہے تھے۔وہ پھولوں کو روندتا چلا رہا تھا، لیکن ونود کی حیرت یہ دیکھ کر اور بڑھ گئی کہ ایک بھی پھول کچلا نہ گیا۔اس نے آنکھیں مل کر دیکھا، وہ سایہ اب ایک مدھوکامنی کے گھنے درخت کے دامن میں پھیلی ہوئی تاریکی میں مدغم ہو گیا۔مدھوکامنی کے پھولوں کی خوشگوار مہک ونود کی ناک سے ٹکرائی، لیکن وہ اس خوشبو سے لطف نہ لے سکا۔اس کا دماغ تو اس وقت ایک عجیب سی الجھن کا شکار تھا۔بانسری کی مدھم لے اب بھی گونج رہی تھی۔

اچانک کسی دروازے کے پٹ کھلنے کی آواز آئی اور پھر کوئی برآمدے میں نمودار ہوا۔ونود نے غور سے دیکھا۔وہ سوشیل تھی۔کھوئے ہوئے انداز میں وہ برآمدے کو عبور کر کے سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگی۔اور پھر کیاریوں کے درمیان آ کر کھڑی ہو گئی۔اس کی دھنسی دھنسی سی آنکھیں اس زرد چاندنی میں ڈوبے ہوئے ماحول پر اس طرح نظریں دوڑا رہی تھیں، جیسے انھیں کسی کی تلاش ہو۔ونود نے دیکھا، وہ سایہ پھر تاریکی سے ابھرا اور آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔سوشیل نے کھوئے ہوئے انداز میں اپنی باہیں پھیلا دیں۔وہ سایہ اس سے کچھ فاصلے پر رک گیا۔وہ آگے بڑھی، سایہ پیچھے ہٹنے لگا۔

''ایشور کے لیے اب مجھ سے دور نہ بھاگو، میرے پاس آؤ۔'' سوشیل کے منہ سے

آواز نکلی، مگر وہ سایہ ہونٹوں پر بانسری لگائے پیچھے ہٹتا رہا اور بانسری کی مدھم سحر آفریں سائے کا جادو جیسے ونود پر بھی چڑھنے لگا۔ اسے جیسے نیند سی آنے لگی ہو، اس نے جلدی سے سر کو جھٹکا اور اپنے دانتوں سے اپنی انگلی کاٹ لی۔ وہ تلملا اٹھا۔

وہ سفید سایہ پھولوں کو روندتا ہوا پیچھے ہٹتا جا رہا تھا، حالانکہ پھول صحیح سلامت تھے اور اسی طرح پیچھے ہٹتا وہ احاطے سے باہر آ گیا۔ وہ اس کی طرف بڑھتی چلتی رہی۔ اب جیسے وہ سحر زدہ ہو یا جیسے وہ کسی نامعلوم کشش سے اس کی طرف کھنچی چلی جا رہی ہو۔

ونود بھی آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھا۔

بنگلے کے سامنے والی سڑک کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر وہ سایہ رک گیا۔ یہاں منڈیر کے بعد ایک خطرناک ڈھلوان تھا، جس پر اگر کوئی گرے تو نشیب کی طرف لڑھکتا چلا جائے۔

وہ سایہ اس کے کنارے پر پہنچ کر رک گیا اور سوشیل پاگلوں کی طرح اس کی طرف دوڑنے لگی۔

''ٹھہر جاؤ، ایشور کے لیے، ٹھہر جاؤ۔ میں آ رہی ہوں۔''

یہ کہتی ہوئی وہ جیسے ہی اس کے نزدیک باہیں پھیلائے پہنچی، وہ سایہ ہوا میں مدغم ہو گیا اور اگر دو مضبوط ہاتھ پیچھے سے سوشیل کو مضبوطی سے تھام نہ لیتے تو وہ منڈیر پر سے الٹ کر ڈھلوان پر اس طرح گرتی کہ نیچے تک پہنچ کر شاید اس کی ہڈیاں بھی چور چور ہو جاتیں۔

وہ ونود کے ہاتھ تھے۔ اس نے سوشیل کو باہوں میں تھام لیا۔

سوشیل نے ایک بار اس کی گرفت سے آزاد ہونے کی دیوانوں کے سی کوشش کی، مگر پھر بے بس ہو گئی۔ اس کی سانس زور زور سے پھولنے لگی اور آنکھیں بند ہونے لگیں۔

پھر اس کا بدن ڈھیلا پڑ گیا اور وہ بے ہوش ہو گئی۔

ونود کے لیے اور کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ اس نے اسے باہوں پر اٹھا لیا اور شانتی کنج کی

طرف لے چلا۔اس وقت جب اس کا مرمریں جسم ونود کے سینے سے لگ رہا تھا،خود ونود کی سانس زور زور سے چلنے لگی تھی اور کبھی ہاتھ کانپنے لگتے۔وہ بہر صورت فرشتہ نہ تھا۔ایک بار تو اس کے دل میں یہ تڑپ پیدا ہوئی کہ بے ہوش سوشیل کو سینے سے بھینچ لے اور اس قدر پیار کرے کہ ...لیکن اس کی نظریں سوشیل کے چہرے پر پڑتے ہی پھسل گئیں۔اس کے پرسکون چہرے پر ایک عجیب سا تقدس،ایک بارعب فرشتگی جھلک رہی تھی۔ایسی جس کے سامنے کوئی گستاخ نظر نہ پڑ سکے۔ونود نے گھبرا کر نظریں ہٹائیں اور جذبات پر قابو پانے کے لیے اس نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

نیک مشورہ

ونود کو کچھ سامان اور پچھلے ماہ کا حساب ونقدی وغیرہ شہر بھیجنی تھی، اس لیے آج وہ سویرے سے ہی آفس میں تھا۔ حالانکہ سرسری نواس نے صبح اسے چائے پر بھی بلایا تھا اور اس نے ڈرائیور کے ہاتھ چٹھی بھیج دی تھی کہ آج وہ نہ آسکے گا، مگر اس مصروفیت میں بھی اسے رات کا واقعہ بری طرح یاد آرہا تھا۔ اگر ایک پہلو سے اس کی نوعیت حیران کن تھی تو دوسرے پہلو سے وہ انتہائی رومان انگیز صورتِ حال تھی، جب ایک حسین، نرم و نازک جسم اس کی باہوں میں سویا ہوا اس کے دل کی دھڑکنوں کے قریب آگیا تھا۔ جب اس نے بے ہوش سوشیل کے سینے کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ اپنی سانسوں کو پھولتا محسوس کیا تھا۔ وہ اس وقت اس کے معصوم لیکن پر وقار حسن سے مرعوب ضرور ہوگیا تھا، مگر بعد میں جب وہی منظر اس کے تصور میں ابھرا تو اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے سوشیل اس کے دل کے بہت قریب ہے۔ خدا جانے یہ کسی دور بھاگنے والی چیز کو پالینے کی غیر ارادی خواہش کا ردِ عمل تھا یا کوئی ایسی خصوصی کشش جو اس کے جذبات پر غالب آگئی تھی۔ وہ بہر صورت اسے فراموش نہیں کرسکتا تھا اور کوشش بھی کرتا تو وہ اتنی ہی اس کے ذہن پر چھائی چلی جاتی۔ اسے کچھ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس کو سوشیل کی ضرورت ہے، اپنی زندگی کے لیے۔

ناشتہ بھی اس نے دیر سے ہی اور آفس میں کیا تھا۔ اس وقت دھوپ بھرپور تھی اور بادلوں کی کہر سے ڈھکی ہوئی ان پہاڑیوں پر چھوٹے چھوٹے سوتے روپہلی سانپوں کی طرح بل کھاتے بہہ چلے تھے۔ وادی کی آبادی کے اطراف میں لہلہاتے کھیت پہاڑیوں کے گیتوں سے گنگنا اٹھے تھے اور ٹیلوں اور ناہموار میدانوں میں چرتے ہوئے مویشیوں کے گلوں میں پڑی ہوئی گھنٹیاں اپنا سریلا مگر بے تسلسل راگ چھیڑے ہوئی تھیں۔

کام سے کچھ تھکن محسوس کرتے ہوئے اس نے سگریٹ جلائی۔ راگھو برآمدے میں بیٹھا ہوا تر کاری چھیل رہا تھا۔

''صاحب۔'' اس نے فرمائشی انداز میں اسے مخاطب کیا۔

''ہُم...'' ونود اس کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

''تون برا نہ مانو تو ایک بات کہی؟''

''کیا ہے؟''

''صاحب، تم بیاہ کا ہے نا ہیں رچائے لیت ہو؟''

''کیوں؟ کھانا پکاتے تمہاری جان نکلتی ہے یا...؟''

''نا ہیں، صاحب، ہمارا مطلب ای بات کہ او ہیں نا او...''

''کون؟''

''او ہی جون بہت پھٹی پڑت ہیں تمہارا پر۔''

''کیا بک رہے ہو؟''

''اب ہم ہن تو بکت ہیں۔ ارے اوپر یما بٹیا نا ہیں تمہارا اوپر لٹو ہوئے گئی ہیں۔''

''تو پھر؟'' ونود مسکرایا۔

''بھگوان کھوب ملائن ہے جوڑی۔''

''ایک اندھا ایک کوڑھی، یہی نا؟''

'رام نہ کرے، صاحب۔'' راگھو نے کان پکڑ لیے۔ ''ہمارا مطلب اہا جوڑی کھوب ہے۔''

''ابھی میرا کوئی ارادہ نہیں۔''

''ای کو نو جندگی ہے، صاحب۔ نا جورونا جاتا۔ اور نہ رام سے ناتا۔''

''ہُم۔ بات تو ہے ایسی۔''

Akram Allahabadi

''صاحب، اونگلری لے آیا ہے نا؟''

''اس سے تمہاری شادی کرادوں، یہی نا؟''

''اب تم سے کا کہی۔ ہم کا اوسے جبکہ ہوئے گوا ہے۔''

''تو یوں کہو نا کہ میری آڑ میں اپنی خبر سنا رہے ہو۔''

''اب تم سے کا کہی۔ تم ہن ماں باپ ہو ہمار۔''

''نہیں، بھائی۔ یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔ اب یہ تو آیا پر منحصر ہے کہ وہ تمہیں پسند کرتی ہے یا نہیں۔ کوئی دخل نہیں دے سکتا۔''

''ارے تو ہم ہورا گھو پہلوان آہیں۔ کا ہے ناپسند کرے۔ اونا ہیں تو ہم اوکر کھاطر دوبیل بھی لڑ بے۔''

''خیر خیر، جب دوبیل (ڈویل) میں جیت جاؤ تو بتانا، تمہاری شادی کے پیسے بھی دے دوں گا، بس۔''

''رام کسم تم صاحب، دیوتا ہو۔'' وہ دعا دینے لگا، پھر ترکاری کی ڈلیا سنبھالتا ہوا وہ گنگناتا چلا گیا۔ ''شیاں بھئے کتوال تون ڈرکا ہے کا، راما، ڈرکا ہے کا۔''

ونود مسکراتا ہوا پلٹا ہی تھا کہ کسی نے پشت سے اس کی آنکھیں موند لیں۔ اس نے ٹٹول کر دیکھا، ہاتھ ملائم اور نازک معلوم ہوئے۔

''اچھا تو تم وہی ہو۔'' وہ ہنس کر بولا۔

''وہ کون؟'' پریما چکمے میں ڈال کر بول ہی پڑی۔

''پریما۔'' اس نے نرمی سے دونوں ہاتھ ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''اونہوں نہہ۔'' پریما نے گنگناہٹ کے ساتھ کہا۔

''تو پھر راجو ہو تم؟''

پریما نے یہ سنتے ہی جلدی سے دونوں ہاتھ ہٹا لیے۔ ونود مسکرانے لگا، مگر پریما کا

چہرہ سست ہوگیا تھا۔وہ گم سم سی رہ گئی۔

''ارے،تم تو چپ رہ گئیں۔کیا ہوا؟'' ونود نے معنی خیز نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ کسی راجو سے بھی آپ کی دوستی ہے اور جو اتنی بے تکلف ہے۔'' وہ روتے ہوئے انداز میں بولی۔

''بس جل گئیں،عورتوں کی تو عادت ہی ہوتی ہے۔''

''میں کیوں چلوں بھلا اور میں ہوتی بھی کون ہوں۔'' پریما اور اکڑ گئی۔

''تم کچھ ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو،لیکن راجو نام کی کسی لڑکی کو میں تو جانتا نہیں۔''

''تب ہی اس کا نام لیا جارہا تھا۔''

''آدمی بہت سے نام تو یوں ہی لیتا رہتا ہے،مثلاً تم ارسطو ہو،تم افلاطون ہو،گدھے ہو وغیرہ وغیرہ۔''

''اب میرا اور مذاق نہ اڑایئے۔'' وہ روندھی سی ہوگئی۔

''ارے،تم تو سچ مچ روٹھ گئیں۔بھئی میں تو مذاق کررہا تھا۔تمہاری آواز میں نے پہلے ہی پہچان لی تھی۔'' ونود ہنس پڑا۔

''بے سبب کسی کا نام منہ سے نکلا نہیں کرتا۔''

''اگر میں وہ فرضی نام نہ لیتا تو تم آنکھوں سے ہاتھ اتنی آسانی سے تو نہ ہٹاتیں۔''

''کیوں؟''

''نفسیاتی ردِعمل۔''

''مگر کیوں؟''

''میں جانتا تھا کہ کسی اور کا نام سنتے ہی تم جل جاؤ گی۔''

''جلیں میرے دشمن،میں کیوں جلوں؟'' وہ اپنی مسکراہٹ کو روکتے ہوئے بولی۔

Akram Allahabadi

اس کا موڈ تبدیل ہو چکا تھا۔

''تب ہی تو اس نے ڈھیر سارے سوالات کر ڈالے۔''

اس جواب پر پریما نے شرما کر سر جھکا لیا۔

''نہ جانے کیوں میں برداشت نہیں کر سکی۔'' وہ سر جھکاتے ہوئے بولی۔

''اچھا یہ تو بتاؤ، یہ ادھر راستہ کیسے بھول گئیں؟''

''میں سمجھی رات والے واقعے کے بعد کہیں آپ کو بھی کچھ ہو نہ گیا ہو، تب ہی تو آج آئے نہیں۔ بس دیکھنے چلی آئی۔''

''خیر، مجھے تو کچھ ہونے والا نہیں، مگر تمہیں ضرور کچھ ہو گیا تھا۔''

''کیا؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔

''غلط فہمی۔'' وہ مسکرایا۔

''اوہ۔'' وہ اطمینان کی ٹھنڈی سانس لے کر ہنس پڑی۔

''اچھا کیا کھاؤ گی پیو گی؟''

''جی کچھ نہیں، بس خیریت پوچھ لی اور چلے۔''

''اونہہ نہہ، مہمان کو اس طرح نہیں جانے دیا جاتا۔''

''تو پھر؟''

''جب تک میزبان اجازت نہ دے۔''

''اور اگر میزبان اجازت ہی نہ دے تو؟''

''نہیں جا سکتیں۔''

''عمر بھر؟''

پریما نے کچھ اس انداز سے یہ سوال کیا کہ وہ چونک کر اس کی شکل دیکھنے لگا۔

''یہ فیصلہ پھر کبھی کریں گے، چلو آؤ، پہلے تھوڑی سی چائے ہی ہو جائے۔''

Akram Allahabadi

اس کے تذبذب کو خوشگوار طور پر دور کرتے ہوئے بولا۔وہ بھی شرماتے ہوئے انداز میں ہنس دی۔کم از کم آج باتوں ہی باتوں میں وہ ایک دوسرے سے بہت کچھ کہہ گئے تھے جو شاید وہ سنجیدگی سے کہنے کی جرأت نہ کر سکتے۔

وہ زیادہ دیر ٹھہری نہیں۔اس نے چائے بھی نہیں پی۔البتہ ونود سے شام کو آنے کا وعدہ لے کر چلی گئی۔اور وہ ونود کے دل میں اپنے پیچھے ایک نئی الجھن، دماغ میں ایک نیا خیال چھوڑ گئی۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

ہنومان گنڈا

نشیب کی بستی میں گھاسی چمار کے مکان پر راگھو دستک دے رہا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا، اس لیے آس پاس سناٹا تھا۔ ویسے بھی گھاسی چمار کا مکان بستی سے علیحدہ ہی واقع تھا۔ وہ اگھوری تو نہیں تھا، مگر اسے اگھوری ہی سمجھا جاتا تھا، کیونکہ بستی والوں کے خیال میں سفلی عمل کرنے والا ہر آدمی اگھوری ہوتا تھا۔ گھاسی چمار سے بستی کے زیادہ تر لوگ خوف کھاتے تھے، بلکہ اکثر جب وہ راستے سے گزرتا ہوتا تو اس کا راستہ کبھی نہ کاٹتے، بلکہ دور سے نکلتے۔ وہ بستی کا جادوگر مشہور تھا۔ اور عام طور پر لوگوں کا خیال تھا کہ اس نے اکثر لوگوں کو جادو کی مٹھ مار کر مار ڈالا ہے۔

شکل وصورت کے اعتبار سے گھاسی چمار ایک جیتا جاگتا کارٹون تھا۔ اکہرا بدن، چھوٹے چھوٹے ہاتھ پیر اور جھریوں دار چھوٹا سا چہرہ، جس پر دو چمکیلی آنکھیں، لومڑی کی سی چالاک فطرت کا پتا دیتی تھیں۔ اس کی چھوٹی سی کھچڑی بالوں والی داڑھی تھی، جس میں انگلیوں پر گنے جانے والے بال اگے تھے۔ چندیا پر بھی چند بال ہی رہ گئے تھے، لیکن وہ اپنی اس ہلکی پھلکی جسامت میں بھی بڑا پھرتیلا اور سخت جان واقع ہوا تھا۔ ایک بار ایک آدمی کو اس نے دھمکی دی تھی اور اتفاق سے اس آدمی کی موت واقع ہوگئی تھی، جس پر اس کے رشتے داروں نے گھاسی کو پکڑ کر اس قدر مارا تھا کہ مرے جیے میں کوئی فرق نہیں رہ گیا تھا اور وہ اسے مردہ ہی سمجھ کر چھوڑ گئے تھے، لیکن ایک ہفتے بعد ہی جب وہ سڑک پر چلتا نظر آیا تو سب کو تعجب ہوا اور کچھ تو اسے بھوت ہی سمجھ لیتے۔ اسے مارنے والے اس ڈر سے کہ سفلی عمل کے ذریعے اب وہ ضرور ان سے انتقام لے گا، بستی ہی چھوڑ کر بھاگ گئے تھے اور کافی عرصے کے بعد واپس آئے۔

گھاسی کھانستا ہوا باہر نکلا تو راگھو کو دیکھتے ہی اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اسٹیٹ منیجر کا

اردلی تھا اور اسسے اچھی رقم وصول ہو سکتی تھی۔

''ارے بھیا تم، آؤ آؤ، لو کہاں بھول پڑے آج ادھر۔'' اس نے دروازہ کھول کر راگھو کو اندر بلایا۔

''گھاسی مہاراج، ہم بہت ضروری کام سے آئے ہیں تمہارے پاس۔''

''ہاں ہاں، بیٹھو تو۔ لو چلم پیو۔'' گھاسی نے اسے چلم پیش کی۔

راگھو تو خود ہی چلم کا عاشق تھا، اس نے جو دم مارا تو چلم سے شعلہ اٹھنے لگا اور کمبخت کو کھانسی بھی نہ آئی۔

''بڑے دم باج ہو، یار راگھو پہلوان۔''

''پہلوان جو ٹھہرے۔'' راگھو نے اپنا پچکا ہوا سینہ ٹھونک کر کہا۔

''مگر مہاراج، اپن اجت (عزت) تنک کھطرے میں آ ہے۔''

''کیوں؟ کیا ہوا؟''

''اب تم سے کا چھپائی۔ بات اصل ای ہائے ہ ہمار یہاں ایک سرسڑی ناس آئے ہن۔ ان کر ماما (آیا) بہت جوردار ہے۔'' وہ بتانے لگا۔

''عشق وشق کا ماملہ ہے کیا؟'' گھاسی نے رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔

''کالی مائی کسم، بس بتا دو اور پھر وہ منتر پڑھ کر دوں کہ لڑھکتی ہوئی تمہار کدموں میں آ کے گرے۔''

''ماملہ تو ن کچھ ایسا ہن پائے۔ پَن جرا۔''

''ارے تو پھر کیا ہے۔ الو کی لکڑی اور گدھے کی لید جرا سی سنگھا دو پھر دیکھو کس کا نام جپتی ہے۔ میرے بوھت کوئی ایسے ویسے تھوڑے ہی ہیں۔ ادھرا سارہ کیا، اور ادھر گھپ اندر۔ آدمی کے دل میں، پھیپھڑے میں اتر جات ہیں اور جدھر چاہو گھما دیتے ہیں۔ ابھی دو مہینے پہلے بنے جادو سے وٹھولا کی گائے کو بکری بنا دیا تھا۔ اور وہ جو سرجو کی ماں ہے نا، مجھے جرا پسند آ گئی

تھی۔بس منتر جو پھینکا تو رات رات بھر میرے دروازے پر سر پٹکنے لگی کہ گھاسی مجھے چرنوں کی داسی بنالے۔اور بھیکوا ہیر تو میرے پیر دھو دھو کے روج پیتا ہے۔اس کی بیوی کے سر پے جو تیلی کا بھوت آتا تھا، بٹیا کی وہ درگت بنائی میں نے کہ ہاتھ جوڑ کے بھاگا اور آج تک لوٹ کے نہیں آیا۔''

''اے ہی کارن تو ہم ہوآئے ہن، مہاراج۔ہمار کلیان بھی کر دیو ننک۔''

''رکھو سوا پانچ روپے۔''

''سوا پانچ، کم نہ کرلو کچھ۔''

''بنیے کی دکان نہیں ہے، راگھو پہلوان۔ہنومان گنڈا یونہی نہیں ملے گا۔''

''ہنومان گنڈا؟'' راگھو سوچ میں پڑ گیا۔پھر اس نے بڑا خشک سا منہ بنا کر ٹینٹ سے سوا پانچ روپے نکالے اور گھاسی کی طرف بڑھا دیے۔

''منتر پھینکا نہ جائے، گھاسی۔''

''ارے ہنومان گھنڈا پہن کر تو سیر کو بھی پچھاڑ لوگے، پہلوان، آدمی کا چیج ہے۔''

''اچھا، لاؤ۔''

گھاسی نے ایک گندی سی پرانی پٹاری سے کالے سوت کا ایک ڈورا نکال کر اسے دے دیا، جس پر کئی گانٹھیں پڑی ہوئی تھیں۔ہر گانٹھ میں ایک چھوٹی سی ہڈی بندھی ہوئی تھی۔

''ای کا ہائے؟''

''بندر کی ہڈی۔'' گھاسی نے بتایا۔

راگھو نے اسے چوما، آنکھوں سے لگایا، پھر جے ہنومان کہہ کر اسے پہن لیا۔

''اب جاؤ۔تمہیں کوئی روستم جمان بھی نہیں ہلا سکتا۔'' گھاسی نے اسے اس کی پیٹھ ٹھونک کر کہا۔

گنڈا پہن کر راگھو نے اپنا پچکا ہوا سینہ ایسا پھلایا جیسے کسی غبارے میں ہوا بھر دی گئی

ہو۔اس کی گردن بھی اونٹ کی طرح اکڑ گئی اور اسے جو بھی آدمی راستے میں ملے، انھیں وہ اس طرح دیکھتا چلا جیسے وہ اگر پھونک مار دے گا تو یہ اڑ کر ہمالیہ پر بت پر جا گریں گے۔

☆☆☆☆☆☆

یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ آج ہی دونوں باتیں ہونی تھیں۔

وہ جس وقت شانتی کنج پہنچا، پریما اور راہل دونوں کہیں گئے ہوئے تھے۔سرسری نواس کچھ پریشان سے نظر آرہے تھے۔لیڈی سری نواس بھی ان کے ہی کمرے میں تھیں۔ونود کو دیکھ کر آج وہ مسکرائے تو نہیں، البتہ انھوں نے کچھ اس انداز میں اس کا خیر مقدم کیا جیسے وہ ان کے ہی خاندان کا ایک فرد ہو۔

''آپ کچھ پریشان نظر آرہے ہیں آج؟''

''کیا بتاؤں، بات ہی کچھ ایسی ہے۔سوشیل شہر واپس جانے سے انکار کر رہی ہے۔''

''تو کیا آپ لوگ واپس جانا چاہتے ہیں؟''

''رات کے واقعے سے میرا ارادہ ہی ہوگیا ہے۔''

''میں سمجھتا ہوں یہ سلیپ واکنگ کا ہی معاملہ ہے۔ویسے ان پر نگرانی رکھی جائے تو شاید یہاں کی آب و ہوا کے اثر سے طبیعت بحال ہونے کے ساتھ ساتھ یہ مرض بھی دور ہوجائے۔''

''ہاں، مجھے اس کی صحت میں تھوڑی سی تبدیلی تو نظر آرہی ہے۔پہلے جس طرح چپ چاپ رہتی تھی، اتنی اب نہیں، لیکن یہ معاملہ...؟''

''آپ کچھ دن اور ٹھہر کر تو دیکھیں، ممکن ہے یہ شکایت باقی نہ رہے۔''

''میں نے شہر میں اپنے فیملی ڈاکٹر کرٹرنک کال کیا تھا، انھیں یہ تمام حالات بتائے،

لیکن انھوں نے عجیب سا مشورہ دیا ہے۔"

"کیا؟"

"وہ کہتے ہیں کہ سوشیل کی فوراً شادی کر دی جائے۔"

"خیال تو برا نہیں ہے۔"

"خیال تو اچھا ہی ہے۔" سرسری نواس نے فکرمندانہ لہجے میں ٹہلتے ہوئے کہا۔

"لیکن..." وہ کہتے کہتے رک گئے۔

"کوئی الجھن ہے؟" ونود نے سامنے رکھی ہوئی کاجو کی تھالی میں سے چند کاجو اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"میرے واقف کار حلقوں میں بھی لوگوں کو یہ علم ہے کہ سوشیل کچھ بیمار ہی رہتی ہے۔ اس لیے جب بھی شادی کی بات نکلی تو پریما کی ہی بات آتی ہے۔ سوشیل کا کوئی تذکرہ نہیں کرتا۔"

"میں سمجھتا ہوں کہ وہ ہزاروں میں ایک ہیں۔" ونود بے خیالی میں کہہ گیا اور سرسری نواس معنے خیز انداز میں اس کی شکل دیکھنے لگا۔ وہ یہ دیکھ کر جھینپ سا گیا۔

"میرا مطلب ہے ان میں کوئی عیب تو نظر نہیں آتا۔ شکل وصورت، تعلیم، سلیقہ، سب ہی کچھ تو ہے۔"

"خیر خیر، میں بھی غور کرتا ہوں۔ اگر تمھیں بھی کوئی شریف اور ڈھنگ کا لڑکا نظر آئے تو دیکھو۔"

"جی، بہتر ہے۔" ونود نے کسی سوچ میں پڑ کر کہا۔ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا لیکن شاید اس کی جرأت نہیں ہوئی۔

دن بھی ڈھل چکا تھا۔ وہ کلائی پر بندھی گھڑی دیکھنے لگا۔ چار بج رہے تھے۔

"گھر آج کچھ سونا سونا نظر آ رہا ہے؟" اس نے چاروں طرف نظریں دوڑا کر کہا۔

Akram Allahabadi

''پریما اور راہل تو گاڑی نکلوا کر کوئی گفا دیکھنے گئے ہیں۔ سوشیل اپنے کمرے میں ہوگی اور میں تو شام اور صبح ہی نکلتا ہوں گھر سے۔'' سرسری نواس نے کہا۔

ونود چپ بیٹھ گیا۔ پھر کچھ دیر بعد اس نے اجازت چاہی۔ رسماً چائے تو اسے پینی ہی پڑی، جو آیا ہی لے کر آئی تھی۔ اس کی شکل دیکھتے ہی ونود کو راگھو یاد آ گیا۔ اسے راگھو کے اس تگڑے انتخاب پر بے ساختہ ہنسی آئی تھی، لیکن وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے چھپا گیا۔ کچھ دیر بعد ہی دینو بھی آ پہنچا۔ وہ سرسری نواس سے کچھ پوچھنے آیا تھا۔ ونود نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ راگھو سے کم از کم دوگنا ضرور تھا اور رگھواسی سے 'دوبیل' لڑنے کی تیاری کر رہا تھا۔

چائے کے بعد ہی اس جانے کی اجازت ملی۔

وہ جب ان کے کمرے سے نکل کر برآمدے کی طرف چلنے لگا تو ایک مہین سی آواز نے اسے روک لیا۔

''سنیے۔''

''اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ سوشیل تھی، جو باریک سفید لباس میں اس وقت بہت خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے سفید جسم اور چاند جیسے حسین چہرے پر یہ ساڑھی کھلی پڑ رہی تھی۔ اور جب سادگی میں اس کا حسن اتنا بے پناہ تھا تو اسے سجاوٹ کے ساتھ دیکھ کر تو کچھ اور ہی عالم ہوتا۔

''فرمایئے۔'' وہ اس کے قریب آ گیا۔

''ڈیڈی آپ سے جو باتیں کر رہے تھے، وہ میں نے سنی ہیں۔''

''تب تو مجھے آپ کے خیال بھی معلوم ہو جانا چاہیے۔'' ونود مسکرایا۔

''وہ اصل میں شہر اس لیے واپس جانا نہیں چاہتی کہ وہاں کے پرشور ماحول میں میری روح گھبراتی ہے اور اکثر وہاں بھی یہی شادی وغیرہ کے تذکرے رہتے ہیں۔'' وہ بتانے لگی۔

Akram Allahabadi

''کیا آپ اس کے خلاف ہیں؟''

''نہ جانے کیوں، مجھے اس خیال سے ہی الجھن ہوتی ہے۔''

''ممکن ہے یہ آپ کی تنہائی پسندی کا ردِ عمل ہو، ویسے یہ تو ایک اچھی ہی بات ہے۔''ونود نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''شاید آپ کا خیال اپنی جگہ صحیح ہو، مگر میں کسی کی شریکِ زندگی بن کر اس کی زندگی تلخ کرنا نہیں چاہتی۔''

''میں نہیں سمجھا؟''

''لوگ کہتے ہیں کہ میں بیمار ہوں، ایک ڈاکٹر نے تو ٹی بی بھی بتادی تھی۔ ویسے وہ نہ بھی کہیں تب بھی میں یہ محسوس کرتی ہوں کہ زندگی کی مسرتیں میرے لیے نہیں ہیں۔''

''مگر کیوں؟''

''میں نے کہا نا کہ مجھے کچھ اچھا ہی نہیں لگتا۔''

''یہ تو آپ کی مرضی پر منحصر ہے، اگر آپ اپنے مزاج کو بدلنے کی کوشش کریں تو شاید...''

''اس دوستانہ نصیحت کا شکریہ، لیکن میں آپ سے یہی درخواست کرنا چاہتی تھی کہ میرے لیے کسی اور کی زندگی کی خوشیاں تباہ کرنے کی کوشش نہ کریں۔''

''وہ کون بدنصیب ہوگا جو آپ کو پا کر مسرت سے مایوس ہوجائے۔''

''نہیں، میں کسی کے لیے نہیں ہوں۔''

''آپ کسی مایوسی کا شکار معلوم ہوتی ہیں۔''

''نہیں۔ مجھے یہ غلط فہمی نہیں ہے، لیکن بس میرا دل ہی نہیں چاہتا۔''

''اور اگر کسی اور کا دل چاہے تو؟''

''میں نہیں سمجھی؟''

Akram Allahabadi

''کوئی اور آپ کو پسند کرتا ہو۔''

''بیکار ہی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئی۔اس وقت ونود کچھ کہنے ہی جا رہا تھا کہ احاطے میں کار داخل ہوئی اور وہ چپ رہ گیا۔کار سے راہل اور پریما اترے۔اور پریما کی نظر جیسے ہی ونود پر پڑی، وہ اس کی طرف دوڑ پڑی۔

''ونود بابو۔''

''آؤ، پریما۔'' ونود نے مسکراتے ہوئے کہا۔

پریما نے آتے ہی بے تکلفی سے اس کا ہاتھ تھام لیا اور ونود سٹپٹا سا گیا۔

سوشیل کے ہونٹوں پر ایک خفیف سی طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی اور پلٹ کر ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔

''آپ کب آئے؟''

''دیر ہوئی۔''

''کیا باتیں ہو رہی تھیں دیدی سے؟''

''بس یونہی۔کچھ موسم کی، کچھ ماحول کی۔''

''تعجب ہے کہ انھوں نے آپ سے اتنی باتیں کر ڈالیں، وہ تو بہت کم بولتی ہیں۔''

''اپنے اپنے موڈ پر منحصر ہے۔''

''تو اب چلے کہاں؟ بیٹھیے نا۔''

''اس وقت نہیں، کافی وقت ہو چکا ہے۔پھر کبھی آؤں گا۔''

''کبھی...یعنی کب؟''

''کب...یعنی صبح یا پھر کل شام کو۔''

''نہیں، رات کا کھانا یہیں کھایئے۔''

''اچھا، زبردستی ہے؟''

''زبردستی ہی سہی، لیکن اگر آپ نے نخرے کیے تو میں آپ کے بنگلے سے آپ کو پکڑ کر لاؤں گی۔''

''اچھا، کوشش کروں گا۔''

''کوشش ووشش نہیں، وعدہ۔'' پریما نے اس کا ہاتھ کچھ اس انداز سے دبا دیا کہ اس کے جسم میں چیونٹیاں سی رینگ اٹھیں۔

''وعدہ کیجیے۔'' وہ بڑے رومانی انداز میں یہ کہہ کر اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ اور اس سے نظر ملتے ہی ونود کو محسوس ہوا جیسے اس کی کنول جیسی کھلی ہوئی آنکھوں کی شفاف جھیلوں میں کہیں وہ ڈوب نہ جائے۔ عورت کے حسن کی کشش سے زیادہ اس کی آنکھوں کی کشش ہوتی ہے۔ وہ ایک لمحے کے لیے مسحور سا ہو گیا۔

''اب کیجیے انکار؟'' سپردگی کے سے انداز میں پریما نے چیلنج کیا۔

ونود چونک پڑا۔ پھر مسکرا دیا۔

''کون کمبخت انکار کر رہا ہے۔''

''تو آئیں گے نا ضرور۔''

''کیا اسٹامپ پیپر پر لکھ کر دوں۔'' ونود ہنس پڑا۔

''آپ کیا لکھیں گے۔'' بڑی دلکش ادا سے یہ کہتی ہوئی وہ ہنستی، اچھلتی چلی گئی۔ راہل ابھی تک باہر ہی اکبر خاں ڈرائیور سے باتیں کر رہا تھا۔ ونود جب نیچے اترا تو وہ سلام کر کے پاس آ گیا۔

''میں نے دینو اور راگھو کا ڈویل طے کرا دیا ہے۔''

''ڈویل تو کیا دو بیل ہی لڑیں گے۔'' ونود نے ہنس کر کہا۔

''تو آپ کو بھی خبر مل چکی ہے۔''

''ہاں بھئی، ہمارا نوکر کلاسیکل قسم کا مسخرہ واقع ہوا ہے۔ ویسے تمہاری آیا بھی ہے

بڑی خطرناک۔"

"خطر ہی خطر ہے، ناک تو اس کے ہے ہی نہیں۔" راہل نے بڑی سنجیدگی سے یہ جملہ ادا کیا۔ جس پر ونود کا قہقہہ چھوٹ گیا۔

برآمدے سے گزرتی ہوئی یہ جملہ آیا بھی سن چکی تھی۔ ونود کے جاتے ہی وہ راہل سے الجھ پڑی۔

"بابا، تم کیسا بولا ہمارا ناک نائیں ہے، یہ اتنا بڑا ناک پھر کیا ڈُکر کا ہے۔"

"اسی کا ہوگا۔" راہل یہ کہہ کر ہنستا ہوا آگے چل دیا اور آیا سوچتی رہ گئی کہ بات اس نے صحیح بولی یا غلط۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

یوجنا کی روح

غروبِ آفتاب میں ابھی تھوڑا وقت باقی تھا۔ دن کی روشنی دھندلی ہو چکی تھی اور سرمئی کہرا وادی کی گہرائی پر چھاتی جا رہی تھی۔ پہاڑیوں پر بادلوں کے گالے ملگجے ہو چلے تھے اور ہوا تر اور خنک ہو گئی تھی۔ سوشیل اس وقت تنہا ایک کھلی چٹائی پر بیٹھی سامنے گہرائی کے پار بادلوں کی کہر سے ڈھکی ہوئی بانگڑاہل کی چوٹی کی اوٹ میں ڈوبتے ہوئے سرخ اور بڑے سے سورج کو دیکھ رہی تھی، جو دن کے بوڑھے ہونے کے ساتھ اپنی تب و تاب و تمازت کھو چکا تھا، جیسے دم نکلنے سے پہلے کسی بیمار کا چہرا سرخ ہو جائے۔ اس نے ایک آسمانی رنگ کی اونی شال کندھوں پر ڈال رکھی تھی اور اس سے چند سو قدم کے فاصلے پر ڈھلوان کی طرف راہل اپنی ایئر گن لیے چڑیاں مارتا پھر رہا تھا۔ اسے محنت کرتے آدھ گھنٹہ ہونے والا تھا، مگر ابھی تک سو چھرّے ضائع کرنے پر بھی ایک چڑیا کا شہید نہیں ہوئی تھی۔

اس غصے میں اس نے گرگٹ وغیرہ بھی تلاش کرنے شروع کر دیے تھے۔ دور نیچے بستی میں جس کے مکانات یہاں سے ننھے منے کھلونوں کی طرح نظر آ رہے تھے، باریک باریک دھوئیں کے سانپ لہرا رہے تھے اور نشیبی میدانوں سے بستی کے گڈریے اپنے مویشیوں کو لے کر لوٹ رہے تھے۔ ان کے گلوں میں پڑی ہوئی گھنٹیوں کی مدھم جھنکار فضا میں ایک عجیب سی نغمگی بکھیر رہی تھی۔

سوشیل کو یہ نغمگی اور ٹھنڈی ہوا کی سرسراہٹ، فطرت کا یہ بے پایاں اور شگفتہ حسن، یہ سب کچھ ایسے لگ رہے تھے جیسے انھیں اس کی روح سے گہرا ربط ہو۔

انھیں یہاں آئے ہوئے آج آٹھواں دن تھا، لیکن سوشیل کو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ جنم جنم سے یہیں رہ رہی ہو، جیسے یہ مناظر، یہ ماحول، یہاں کی ہر چیز اس سے مانوس ہو۔

Akram Allahabadi

اچانک ہوائیں گونجنے لگیں اور پہاڑیاں جاگ اٹھیں۔

وہی پراسرار، پرکشش اور روح کو تڑپا دینے والی سریلی گونج ہواؤں کے دوش پر لہراتی ہوئی، جیسے سمندر کی موج کنارے سے ٹکرائے اور لوٹ جائے۔اس کے کانوں میں رس گھلنے لگا اور نظریں دور بانگڑاہل کی بلندیوں پر بھٹکنے لگیں۔

لہراتی ہوئی بانسری کی آواز کسی طوفان کی طرح قریب آئی اور اس کے کانوں سے ٹکرائی، پھر مدھم ہوتی ہوئی دور افق میں جا کر ڈوب گئی۔

اس کی رح تڑپ اٹھی۔

اور وہ کھو گئی۔

جیسے کسی نے اسے مسحور کر دیا ہوں۔وہ اٹھی اور اس کے قدم آگے بڑھنے لگے۔

نیچے راہل بھی اس آواز کو سن کر چونک سا پڑا۔اور جب اس نے پلٹ کر دیکھا تو سوشیل اپنی جگہ نہیں تھی۔

''دیدی...''اس نے پکارا، مگر کوئی جواب نہ ملا۔وہ چڑیوں کا شکار بھول گیا۔

''دیدی....''اس نے دوبارہ آواز دی اور پھر اسی طرف دوڑا جہاں وہ سوشیل کو چھوڑ آیا تھا۔

لیکن سوشیل کے قدم اب تیزی سے اسے بانگڑاہل کی طرف لے جا رہے تھے اور بانسری کی وہ پراسرار آواز جیسے اسے کسی نظر نہ آنے والی ڈور میں باندھ کر کھینچ رہی تھی۔

وہ چلی جا رہی تھی، عالم و مافیہا سے بے خبر۔

دنیا کے ہر تعلق، ہر واسطے سے بے نیاز۔

پھر وہ دوڑنے لگی۔

بانسری کی لہراتی ہوئی سریلی آواز اور تیز ہو گئی اور بادلوں کی کہر جھومنے لگی۔

وہ اور تیز دوڑنے لگی۔

Akram Allahabadi

ویران سناٹے میں بانسری کا شور بڑھتا گیا۔

اس کے قدم نشیب فراز سے بے نیاز اس کے وجود کو ناہموار بلندی کی طرف گھسیٹتے گئے۔اور دور پیچھے راہل کی کمزوری آواز اسے پکار رہی تھی۔

''دیدی...''

مگر اس وقت وہ بہری تھی۔اس کے کان دنیا کی کوئی آواز نہ سن سکتے تھے۔وہ صرف ایک آواز سن رہے تھے۔

وہی پراسرار، پرکشش گونج۔

شاید اتنی تیزی سے، اتنی آسانی سے وہ کبھی بانگڑاہل پر نہ چڑھ سکتی۔یہ تو کوئی معجزہ ہی تھا۔

بادلوں کا دیش اب تھوڑی ہی دور رہ گیا تھا۔

وہ ملگجی نم کہر جو اپنے اندر قدرت کا ایک سربستہ راز چھپائے ہوئے تھی، دھول اور دھوئیں سے بادل اور درختوں کی چوٹیوں اور بلند جھاڑیوں پر اس طرح چھائے ہوئے تھے، جیسے بانگڑاہل کی گردن کے گرد سفید اونی گلوبند لپیٹ دیا گیا ہو۔وہ گونج یہاں ہر طرف پھیلی ہوئی تھی، جیسے گوشے گوشے سے وہی ایک سریلی تان پھوٹ رہی ہو۔

''یوجنا...'' وہ دوڑتے دوڑتے چیخی۔

''بس کرو، یوجنا۔دیکھو میں آ گئی۔''

''آجاؤ، یوجنا...اب نہ چھپو میری نظروں سے۔''

اور اس کی آواز بادلوں کے کہر سے ٹکرا کر پھیل گئی۔

وہ ہانپتی ہوئی ایک چٹان پر جھک گئی، جس کے قریب ہی ایک باریک سا سوتا گنگناتا گزر رہا تھا۔جیسے کوئی موتی رول رہا ہو۔

اس وقت سوشیل کی عجیب سی کیفیت تھی۔آنکھیں جیسے نکلی پڑ رہی ہوں اور سانس

Akram Allahabadi

سینے میں نہ سماتی ہو۔

آجاؤ... یوجنا... میں مرجاؤں گی۔ایشور کے لیے ...آ...آجاؤ...''اس نے ایک ہاتھ سے اپنا سینہ دبا کر سر چٹان پر ٹیک دیا۔

اچانک ابر کی کہر میں جیسے مدھم سفید روشنی کے دائرے ناچنے لگے اور بھرپور بانسری کی تان کوئی اچھوتا بڑا دلگداز بڑا الفریب نغمہ چھیڑنے لگی۔

بادلوں سے اس سریلی گونج کے ساتھ ایک مدھم سفید سایہ ابھرتا نظر آیا، جیسے وہ کہیں بہت دور کسی دوسری دنیا سے چلا آرہا ہو۔دھند اور کہر میں ڈوبا ہوا۔

شاید اس انجانے دیس سے جہاں سہانی شاموں روحیں ابدیت کے پرکیف و پرسکون نغمات گاتی پھرتی ہوں، جہاں خلاء ہی خلاء ہو۔ایک غیر محدود، بے روک بے کراں پھیلاؤ، جہاں فطرت کی سادگی اور روحوں کے سکوت کے ساتھ احساسات کا باسرِ گراں ڈھونڈھے نہ ملے۔

''یوجنا۔''وہ کہر سے نمودار ہوتے ہوئے اس دھندلے سفید انسانی خاکے کو دیکھتے ہی چیخ اٹھی اور اس کی سرخ ہوتی ہوئی آنکھوں میں نمی چھلکنے لگی۔اس کے ہاتھ کانپنے لگے جو اس نے پھیلا دیے تھے۔وہ اس دھند سے باہر نکل رہا تھا۔اس کی بانسری اس کے ہونٹوں سے لگی تھی اور بدن باریک سفید لباس میں ڈھکا تھا۔

وہ بے اختیار اس کی طرف دوڑ پڑی۔اس نے بانسری اپنے لبوں سے ہٹالی اور گونجتی پہاڑی ساکت ہوگئی، جیسے درختوں نے پتے ہلانا بند کردیا ہو، جیسے تیز رو ہوائیں تھم گئی ہوں گی اور پرندوں کا شور اچانک ختم ہوگیا ہو، لیکن اس پر ہول سکوت میں بھی دور نشیب کی طرف ایک باریک آواز سنائی دے رہی تھی۔

''دیدی...تم کہاں ہو...؟دیدی...''

ایک بڑی میٹھی خوشگوار سی مسکراہٹ اس حسین مردانہ خاکے کے لبوں پر ابھری جو کہر

سے نمودار ہوا تھا اور پھر وہ پیچھے ہٹنے لگا۔ آہستہ آہستہ... وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر آگے بڑھنے لگی۔ وہ پیچھے ہٹتا گیا۔

''مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ، یوجنا۔ میں نے پورے ایک جنم تک تمہارا انتظار کیا ہے اور تم آج ملے ہو۔''

سایہ پیچھے ہٹتے ہٹتے کہر میں ڈوبنے لگا۔

''یوجنا.. اگر تم اس بار بھی نہ ملے تو میں کبھی نہ مل سکوں گی تمہیں۔ ٹھہر جاؤ، یوجنا۔''

مگر وہ بادل جیسا سفید مرتعش وجود اسی کہر میں ڈوبتا چلا گیا۔ چھپتا چلا گیا۔

''یوجنا...'' وہ چیخ کر بادلوں کی نمی میں گھس گئی۔ مگر اسے کچھ نظر نہ آیا، سوائے ایک ٹھنڈی چمکیلی نرم سفیدی کے جو چاروں طرف چھائی ہوئی تھی۔ وہ اسی طرح بڑھتی گئی، یہاں تک کہ پھر اس کے کان وہی مدھم سریلی گونج سننے لگے، جو کبھی تیز ہو جاتی، کبھی مدھم۔

''مجھے یوں نہ تڑپاؤ، یوجنا... یوجنا...''

وہ چیخی اور دوڑنے لگی، اونچائی کی طرف۔

کہر ہلکی ہونے لگی۔ سریلی گونج مدھم ہوئی پھر تیز ہو گئی اور وہ بادلوں سے اوپر نکل آئی۔ میگھ دوت کی پہاڑی کی چوٹ پر۔ یہاں ہلکا سفید دھواں ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ ایسی کہر جیسی دسمبر کے سویروں میں میدانوں پر پھیلی ہوتی ہے اور اس کہر میں ڈوبے بہت پرانے شکستہ وشنو مندر کی سیڑھیوں پر وہ بیٹھا ہوا تھا۔ اور اس سے دس قدم دور تلسی کا چبوترہ ٹوٹا پڑا تھا۔

ایک جنگلی بیل مندر کی جڑ سے بڑھ کر اس کے ایک سالم ستون پر اس طرح لپٹتی چلی گئی تھی، جیسے اس کے گلے لگنے کے لیے ہی زمین سے ابھری ہو۔ مندر کے شکستہ دریچوں سے نیلگوں آسمان جھانک رہا تھا، جس کے نشیبی حصے پر اب بھی چند سرخ پٹیاں باقی رہ گئی تھیں۔ حالانکہ تاریکی چھا چکی تھی۔

''یوجنا...'' وہ اسے دیکھتے ہی حلق پھاڑ کر چیخی۔

Akram Allahabadi

اس سفید خوبصورت وجود نے بانسری ہونٹوں سے ہٹالی اور فضا ساکت ہوگئی۔

سوشیل نے دوڑ کر اس کے قدم تھام لیے اور ان پر سر رکھ دیا اور سسکیاں لے کر روتی جارہی تھی اور اس کے شفاف گورے پیروں پر ہاتھ پھیرتی جارہی تھی۔اس کے آنسو اس کے قدموں کو تر کر رہے تھے۔

یوجنا کے سفید باریک ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور اس کی آنکھوں میں ایک بڑی شدید روحانی وقار سے بھرپور محبت کی چمک پیدا ہوگئی جیسے ویرانے میں دو ستارے چمکنے لگے ہوں۔

''دیدی...''میگھ دوت کی پہاڑی پر راہل کی آواز گونجی اور سناٹا مرتعش ہوگیا۔

وہ بادلوں کی کہر میں گھستا چلا گیا۔اس نے دور سے چوٹی پر ایک سفید سایہ دیکھ لیا تھا جو سوشیل کا ہی ہوسکتا تھا۔

شکستہ مندر کے آثار دیکھتے ہی وہ ٹھٹک کر رک گیا۔

اسے سوشیل کی آواز سنائی دی۔

''مجھے اب چھوڑ کر نہ جانا، یوجنا۔میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔تم اس بار مجھ سے نہیں بچھڑ سکتے۔میں نے تمہیں ہی پانے کے لیے یہ دوسرا جنم لیا ہے۔''

راہل کو دیکھ کر تعجب ہوا کہ وہ سیڑھی پر سر رکھے اپنا ایک ہاتھ سیڑھی پر پھیرتی جارہی تھی اور بڑبڑا رہی تھی۔اس نے چاروں طرف دیکھا، اسے وہاں کسی کا وجود بھی نظر نہ آیا۔

قریب پہنچ کر اس نے سوشیل کو جھنجوڑ ڈالا۔

''دیدی، تمہیں یہ کیا ہوا ہے؟ تم کس سے باتیں کر رہی ہو؟''

وہ کچھ نہ بولی اور اسی طرح سیڑھی پر ہاتھ پھیرتی رہی۔

''دیدی...''راہل نے اسے پوری طاقت سے جھنجوڑا۔وہ چونک پڑی۔

''دیدی، یہ کیا ہوا ہے تمہیں جو پاگلوں جیسی حرکتیں کر رہی ہو؟''

Akram Allahabadi

جواب میں وہ دھنسی دھنسی آنکھوں سے اس کی شکل دیکھنے لگی۔

ایسا لگتا تھا جیسے نظریں راہل کے چہرے پر ہوں اور ذہن کہیں اور بھٹک رہا ہو۔

''دیدی...دیدی...دیدی...'' راہل اسے جھنجوڑتا ہی گیا۔ یہاں تک کہ وہ پلکیں جھپکانے لگی۔ پھر اس نے تعجب سے راہل کو دیکھا اور اسی انداز میں چاروں طرف نظریں دوڑانے لگی۔

''کیا ہو گیا تھا تمہیں، دیدی؟'' راہل نے پوچھا۔

''مجھے؟ کچھ نہیں...اوہ، شاید میں بے خیالی میں اتنی دور نکل آئی۔''

اس نے اس طرح کہا جیسے اسے کچھ یاد نہ ہو کہ کچھ دیر پہلے اس پر کیا کیفیت گزری تھی۔ ویسے اس کی آنکھوں میں ویرانی اب بھی باقی تھی۔

''چلو، دیدی، گھر چلیں، رات ہو رہی ہے۔''

اس نے بہن کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ سوشیل کچھ نہ بولی اور اس کے ساتھ چلنے لگی۔ مگر وہ پہاڑی کے اس حصے کو، بادلوں کو اور اس شکستہ مندر کو پلٹ پلٹ کر دیکھتی جاتی تھی۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

دو بیل

نشیب کی بستی میں گھاسی چمار کے گھر کے سامنے کا میدان ولبھ بھائی پٹیل اسٹیڈیم بن گیا تھا۔ بستی کے دو چار سو آدمی اس اکھاڑے کے گرد جمع تھے، جس میں راگھو پہلوان کھڑا ڈینگیں ہانک رہا تھا، گھاسی چمار کا دیا ہوا ہنومان گنڈا اس کے گلے میں لٹک رہا تھا۔ ابھی تک اوپر سے اس کا رقیب روسیاہ میدان میں نہیں پہنچا تھا۔ یہ تو بستی والوں کو بھی معلوم ہو چکا تھا کہ راگھو کسی عورت کے لیے ایک آدمی سے دو بیل لڑ رہا ہے اور وہ یہی سمجھے تھے کہ ایک بیل تو خود راگھو ہوگا اور دوسرا اس کا رقیب۔ راگھو پہلوان کہہ رہا تھا۔

''آج سسرے کا بھرتہ نہ بنائے دیا تو ن ہمار نام بھی راگھو پہلوان نہیں۔''

کچھ لوگ اس کے اس اکہرے دیل کو دیکھ کر ہنس دیے، مگر جب راگھو نے سینہ پھلا کر جے ہنومان بولی، تو بعض کو یقین ہو گیا کہ آج تو گیدڑ شیر ہو گیا ہے۔

''دیکھا، ڈر گوا نا سسرا دینو پیو۔ ابہن تلک پتا نا ہیں نجر آت۔''

اتنے میں کسی نے اسے توجہ دلائی کہ اوپر سے موٹر آ رہی ہے۔ شاید تمہارا رقیب گاڑی پر چڑھ کر آ رہا ہے۔ رتھ تو اس زمانے میں چلتے نہیں۔

اور واقعی جب کار قریب آ کر رکی تو ونود والی اسٹیشن ویگن ہی تھی۔ اس میں سے صرف تین آدمی اترے۔ چوتھی شخصیت اس حور تمثال کی تھی جس کی خاطر یہ ڈویل لڑی جا رہی تھی۔ وہ کار میں ہی چڑھی بیٹھی رہی اور وہ تو شاید آتی بھی نہیں، مگر راہل زبردستی اسے لے آیا تھا۔ یہ سارا تماشا اسی کا رچایا ہوا تھا۔ دینو کو بھی اسی نے اشتعال دے کر اس چیلنج کو قبول کرنے پر اکسایا تھا اور راگھو تو خیر ہمیشہ ہی اپنی پہلوانی کے مغالطے میں رہتا تھا۔

ایک بار دینو کو مقابلے کے لیے سامنے سے آتا دیکھ، راگھو کی پہلوانی کو کچھ جھرجھری

سی آئی، لیکن ایک تو کار میں آیا بیٹھی تھی، دوسرے مقابلہ دیکھنے والے لوگ، اس لیے اس نے چہرے کو اور خوفناک بنا لیا۔ گھاسی پاس ہی کھڑا تھا۔ راگھو کے مدِ مقابل کو دیکھ کر وہ کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے راگھو کو اشارہ کیا کہ وہ ابھی آتا ہے۔

راہل اور دینو کے ساتھ ڈرائیور اکبر خاں بھی یہ تماشا دیکھنے کار سے اتر آیا تھا۔ اس نے راگھو کو سینہ پھلائے دیکھ کر دور ہی سے للکارا۔

''اوئے مچھر کا اولاد، سینہ پھلانے سے گدھا پہلوان نہیں بن جاتا۔''

دینو نے راگھو کو دیکھ کر اپنے بازوؤں کی مچھلیاں پھلائیں اور اسے گھورنے لگا۔

''گھورت کا ہے کو ہورے ہمار دشمن۔ اب ہن مکابلہ میں پتا چلے ہے۔'' راگھو جھینپ مٹانے کے لیے بولا۔

''ابے تم سالا تو ہیک (ایک) گھونسے میں مریم ڈائیو (میرین ڈرائیور) پونچ جائینگا، اکڑتا کاہے کو ہے۔'' دینو نے اپنی بمبئی والی زبان میں جواب دیا۔

''نہیں بھئی، پہلے سے نہیں لڑو۔ ڈویل میں تو پہلے دوستی ہی رہتی ہے۔ بس مقابلے کے وقت مقابلہ ہوتا ہے۔'' راہل نے دونوں کو سمجھایا۔

''پن یہ تو کستی کا املہ ہے، چھوٹے بابا۔ آپ تو بولا تھا انگریجی میں ڈویل ہوئینگا۔''

''ہاں ہاں۔ تم دیکھتے جاؤ۔'' راہل نے یہ کہہ کر جیب سے دو پستول نکالے، جنہیں دیکھتے ہی دینو اور راگھو دونوں سٹپٹا گئے۔

''لو، ایک تم لو اور ایک تم اور دونوں یہاں میدان میں ایک دوسرے سے دس قدم کے فاصلے سے کھڑے ہو جاؤ منہ پھیر کر۔ میں ایک، دو، تین بولوں گا، بس تین بولتے ہی تیزی سے پلٹ کر ایک دوسرے پر گولی چلا دینا، جس کی گولی پہلے لگی وہی جیتا۔'' راہل نے بتایا۔ اس پر تمام لوگ گھبرا کر پیچھے ہٹنے لگے۔

''ناہیں بابا، ہم جیو ہتیا نہ کریئے۔'' راگھو کان پکڑنے لگا۔

Akram Allahabadi

''تب تو دنیا تمہیں ڈرپوک اور کمزور کہے گی۔اور آیا تو تمہارے نام پے بھی نہ تھوکے گی۔''

''پن بابا، یہ گولی اندر اور دم باہر والا ماملہ اچھا نا ہیں۔'' دینو نے بھی احتجاج کیا۔

''تم دونوں بزدل ہو۔ارے فرہاد تو تیشے سے اپنا ہی سر پھوڑ کر مر گیا تھا شیریں کے لیے۔تم اتنا بھی نہیں کر سکتے؟''

''کون پھریاد؟'' راگھو نے گلے میں تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔

''تھا ایک تگڑا عاشق ایک شہزادی کا۔دیکھو، آج تک دنیا اسے یاد کرتی ہے۔''

''ہاں ہو، ہم ہو کہیں سیریں فرہاد کا کھیل بھی سنا رہا۔ہائے ہائے، کا عاشق ماسوق رہے دونوں۔''

''بس تو تم بھی ایسا ہی نام کما لو۔'' راہل نے اسے اکسایا۔

''ای بات ہے۔اچھا تو لاؤ۔'' راگھو کو جوش آیا، مگر جب اس نے پستول ہاتھ میں لیا تو اس کا ہاتھ کانپنے لگا۔دینو کا بھی بس نہ چلا۔

سوال غیرت کا تھا، مگر اندر ہی اندر دونوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ اللٹپ گولی چلا دیں گے اور مقابلہ ختم ہو جائے گا، بہادری بھی رہ جائے گی۔

راگھو نے گنڈے کو چوما اور پیچھے ہٹ گیا۔لوگوں کا مجمع بھی دور ہٹ گیا تا کہ کہیں گولی کسی اور کو نہ لگ جائے۔

دینو اور راگھو دونوں کو پستول چلانے کا طریقہ راہل نے سمجھا دیا تھا۔وہ دونوں بڑی زور سے آنکھیں میچ کر ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کر کے کھڑے ہو گئے۔

راہل نے پہلے ایک کہا، پھر دو اور جیسے ہی تین کہا، دونوں ایک ساتھ ایک دوسرے کی طرف پلٹے اور آنکھیں بند کیے ہی پستول کی لبلبی دبا دی۔پستول کی نالی سے سیاہی کی تیز دھار نکل کر دونوں طرف چہروں پر پڑی اور سینکڑوں قہقہے ایک ساتھ بلند ہوا ٹھے۔اس وقت صحیح

معنوں میں دونوں ایک دوسرے کے رقیب گروسیاہ بن گئے تھے۔

ہنسی کا طوفان ختم ہوا بھی نہ تھا کہ گھاسی چمار آپہنچا، اس کے ہاتھ میں ایک بہت پرانے قسم کا رجواڑی جوتا تھا۔لوگ حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔

''راگھو پہلوان، اب دیکھتا ہوں کہ کون تجھے مارسکتا ہے؟'' گھاسی چمار اکڑ کر بولا۔

راگھومنہ پونچھ کراس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''چل جھکاسر...سر جھکا، میں کہتا ہوں۔'' گھاسی نے بڑے رعب کے ساتھ کہا۔

اورراگھونے جلدی سے سر جھکا دیا۔

کچھ کہے بغیر گھاسی نے اس پھٹے جوتے سے پانچ جوتے راگھو کے سر پر مارے، تب کہیں جا کر وجہ تسمیہ بتائی۔

''یہ مہارتھی کرن کا جوتا ہے، جویدھ کے میدان میں چھوٹ گیا تھا۔میرے باپ دادوں کے باپ دادوں کے جمانے سے اسے سنبھال کے رکھا ہوا ہے۔بیٹا، جس کے سر پے چھلا دو، وہ سورما بن جاتا ہے۔'' گھاسی نے بتایا۔

''تب تو، مہاراج، دوئی چار اور لگا دیئو۔'' راگھو نے پھر سے سر جھکا کر کہا۔

''نہیں، ہر چیج کائدے کانون سے ہوتی ہے۔'' گھاسی نے مزید رعایت دینے سے انکار کر دیا۔

دینو بھی منہ صاف کر کے مقابلے میں آ گیا۔اور طے یہ ہوا کہ ہندوستانی طریقے پر معاملہ صاف کرلیا جائے۔چنانچہ دونوں اکھاڑے میں اتر پڑے۔

دینو کو تو پہلوانی سے علاقہ ہی نہیں تھا۔اس نے جو دو چار ہاتھ مارے تو راگھو کے ہوش خطا ہو گئے۔وہ بار بار جے مہارتھی کرن اور جے ہنومان بولتا جاتا اور مار ہی کھاتا جاتا۔پھر وہ گھاسی چمار کو گالیاں دینے لگا۔مگر اس جھگڑے میں کیونکہ دینو کے ہاتھ پڑنے سے راگھو کا

ہنومان گنڈا ٹوٹ گیا تھا، اس لیے گھاسی کو بہانہ ہو گیا۔ اس نے اسی کو آڑ بنا کر الٹا راگھو کو ہی ڈانٹنا شروع کر دیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد راگھو کی درگت بن گئی اور اس کی پہلوانی بھیک مانگتی نظر آنے لگی۔ آخر کار فتح کا سہرا دینو کے سر ہی بندھا۔ بڑے نخروں سے آیا نے اتر کر اپنی جے مالا دینو کے گلے میں ڈالی، مگر ساتھ ہی وارننگ بھی دے دی۔

''تم سالا اپنے سے بھوت بہادر نہیں بننا ہمیں تو میں راگھوا گھوئیں ہے۔''

دینو نے بڑے ہیروانہ انداز سے اس کا ہاتھ تھام کر اسے یقین دلایا کہ۔

''تو سو جوتے بھی مارے گی تو میں ہف نہیں کرینگا۔''

ابھی یہ تقریب جاری ہی تھی کہ لوگ ہٹنے لگے۔ سامنے سے اپدیش اپنے گدھے پر بیٹھا آرہا تھا۔ طنبورہ ہاتھ میں اور چہرہ عجیب سا بنا ہوا۔

''ارے ہار گیا۔'' وہ دور سے ہی چیخا۔ ''پہناؤ، پہناؤ اسے جوتوں کا ہار پہناؤ۔'' پھر وہ دینو کی طرف مخاطب ہوا۔

''رن بھومی سے لوٹنے والا سورما بڑی شان سے گھوڑے پر لوٹتے ہیں۔ لو، میرا گھوڑا حاضر ہے۔''

اشارے کی دیر تھی۔ سب نے مل کر دینو کو گدھے پر سوار کر دیا۔ ایک مورسلی کا خشک ہار جو اپدیش کے گدھے کے گلے میں نہ جانے کب کا پڑا ہوا تھا، اپدیش نے وہ بھی نکال کر دینو کے گلے میں باندھ دیا۔ اور خود گدھے کی لگام پکڑ کر چلنے لگا۔

''ارے بولو جگت سورما کی جے۔''

لوگ اس کا کہا بہت مانتے تھے اور ایسے معاملوں میں تو ویسے بھی سب شامل ہو جاتے ہیں، چنانچہ اس شان سے فاتح دولھا کی سواری بستی سے روانہ ہوئی۔ راہل کو تو اتنا لطف آرہا تھا کہ اکبر خاں کو آیا کو گاڑی سے واپس لے جانے کی ہدایت کر کے وہ خود اس سورما

کی بارات میں شریک ہوگیا۔

اپدیش سارے راستے نعرے لگاتا رہا۔

اور جب یہ سواری شانتی کنج کے سامنے پہنچی تو شور سن کر سرسری نواس خود نکل آئے۔ انھوں نے جب گاؤں کے لڑکوں کو دینو کے پیچھے تالیاں بجاتے اور اسے گدھے پر سوار ہار پہنے دیکھا تو وہ ہنس پڑے۔اپدیش اب بھی نعرے لگا رہا تھا۔'' جگت سورما کی جے۔'' اور لڑکے اس نعرے کو دہرا رہے تھے۔

لیڈی سری نواس، سوشیل، پریما بھی باہر نکل آئے اور پریما کا تو ہنستے ہنستے برا حال ہوگیا۔

'' یہ سب راہل کی شرارت ہے، ڈیڈی۔'' پریما نے بتایا۔

مگر اس وقت راہل کا تو پتا بھی نہ تھا۔

دینو کی نظر جیسے ہی سرسری نواس پر پڑی وہ گدھے سے کود کر اتنی تیزی سے بھاگا کہ گرتے گرتے بچا، لیکن اپدیش ہنسنے لگا۔

'' سوئمبر رچا کے لایا ہوں مہاراج کے بنگلے پر۔کون گدھے کا بچہ مبارک باد دے گا مجھے۔وہ تو مر گئے جو مرغی بیچتے تھے۔ہائے... میرے لنڈورے گدھے کو کون تسلی دے گا اب۔''

مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا، اس کی نظر اچانک سوشیل پر پڑ گئی۔

وہ چونک پڑا اور اس نے سر جھکا لیا۔

'' راج کماری، ہائے... تم ابھی تک مریں نہیں۔''

یہ کہہ کر وہ پیچھے ہٹنے لگا۔اس جملے پر سرسری نواس اور لیڈی سری نواس بھی چونک پڑے، لیکن خود سوشیل نے جیسے سنا ہی نہیں۔وہ بس اس بوڑھے پاگل کی شکل دیکھ رہی تھی۔

سرسری نواس نے اپدیش کو پکارا بھی، مگر وہ اپنا گدھا لے کر چل دیا۔اور بستی کے

لڑکے اس کے پیچھے تھے۔ وہ اس وقت طنبورہ بجا بجا کر گا رہا تھا۔

ایک روح بھٹکتی ہے
ویران پہاڑوں میں
کچھ ہوش کی باتیں کرو
کچھ بھینس کے انڈے کھا
چل چل رے میرے گھوڑے
میرے پیارے لنگڑ دین
ٹکے کے تین
ساڑھے تین
پونے چار
دوانّی کا اچار
آیا چوہوں کو بخار
بلی اور بجے گی

''تھوڑی تھوڑی'' گاؤں کے لڑکوں نے ہم آواز ہو کر دہرایا۔

''اور بجے گی'' اپدیش نے کہا۔

''تھوڑی تھوڑی دیر'' لڑکے پھر دہرانے لگے۔

''کیا...؟'' اپدیش نے پلٹ کر پوچھا۔

''تیری کھوپڑی۔'' لڑکے ہم آواز ہو کر چیخے اور بھاگ اٹھے۔ اپدیش نے مارنے کو پتھر اٹھایا، مگر پھر پتھر پھینک کر ہنسنے لگا۔ وہ جھک کر آہستہ سے اپنے گدھے کے کان میں بولا۔

''دیکھ، تجھے اور مجھے گدھا سمجھتے ہیں۔ ہیں نا گدھے... کیوں... ہیں نا؟''

☆☆☆☆☆☆

پیشکش

راہل نے جو کچھ بتایا تھا اسے سن کر سرسری نواس اور چکر میں پڑ گئے تھے۔انھیں یہ یقین سا ہو گیا تھا کہ یہاں آ کر سوشیل پر کسی پاگل پن کا اثر ہو گیا ہے، یا کسی آسیب کا سایہ، جیسا کہ ان کے نوکر دینو نے انھیں مشورہ دیا تھا۔وہ اب یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ کسی قیمت پر وہ اپنے خاندان کے لے کر شہر لوٹ جائیں گے،لیکن مالی نے لیڈی سری نواس کو یہ یقین دلایا تھا کہ بستی میں ایک جادوگر ایسا ہے جو اس آسیب کو بٹیا کے سر سے اتار دے گا۔اور ترقی پسند تہذیب رکھتے ہوئے بھی مشرقی خیالات کی توہم پرستی لیڈی سرسری نواس پر غالب آ گئی تھی۔اس لیے ان کی ضد سے مجبور ہو کر سرسری نواس نے ایک دن اور قیام کرنا منظور کر لیا تھا۔

ونود جس وقت ان کے بنگلے پر پہنچا اسے ڈرائیور اکبر خاں اور مالی باہر کھڑے نظر آئے۔

''کیا بات ہے؟''اس نے اکبر خاں سے پوچھا۔

''خوچہ ام کیا بولے، صاحب۔یہ مالی کا بچہ احمق گھاسی چمار کو لے کے آیا ہے بابا کا بوت بگائے گا۔''

''کیا حماقت ہے یہ۔''ونود نے مالی کو گھورا۔

ہجور، گھاسی نے ادھر بستی میں بہت سے بھوت بھگائے ہیں۔''مالی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''گدھے ہو پورے۔''وہ یہ کہہ کر اندر گھس گیا۔اسے سرسری نواس ڈرائنگ روم میں ہی اکیلے بیٹھے نظر آئے۔ونود کو دیکھتے ہی انھوں نے بلا لیا۔

''کیا آپ بھی ایسی باتوں میں یقین رکھتے ہیں؟''ونود نے ان سے پہلا سوال یہی

کیا۔

''اگر تمہارا مطلب اس جادوگر وغیرہ سے ہے تو ان حماقتوں میں میرا کوئی دخل نہیں ہے۔میری مسز ہی کچھ توہم پرست وقع ہوئی ہیں اور یہ ان کی ہی ضد پوری کی جارہی ہے۔'' سر سری نواس نے برا سامنہ بنا کر کہا۔

''میں تو اس لڑکی کے مستقبل سے مایوس ہو چکا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے ان کا لہجہ اداس ہوگیا۔

''دنیا میں ہر مرض کا کوئی نہ کوئی علاج ضرور موجود ہے۔آپ کو مایوس نہ ہونا چاہیے۔''ونود نے تسلی دی۔

اتنے میں اندر سے ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ونود بے چین سا ہوگیا۔

''یہ اس کا علاج ہورہا ہے۔جاؤ، اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔'' سر سری نواس نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ونود کچھ نہیں بولا۔ وہ اٹھ کر اس دروازے کا پردہ اٹھا کر اندر چلا گیا، جدھر سے آواز آئی تھی اور یہاں اسے عجیب سا تماشا نظر آیا۔

راہل اور پریما نے زبردستی سوشیل کو دونوں بازوؤں سے تھام رکھا تھا اور گھاسی چمار اس کے سامنے ایک سکڑی میں دہکتے انگاروں پر مرچ کے بیج اور ماش کے دانے اور نہ جانے کیا کیا الا بلا بھنک بھنک کر منتر پڑھ رہا تھا۔

مرچ کے بیجوں کے چٹکنے کے ساتھ ساتھ اس کے دھوئیں سے سوشیل کا برا حال تھا۔ کھانسی کے ساتھ جیسے دم گھٹا جارہا ہو۔اور اس کی چیخ کی کوئی پرواہ نہیں کر رہا تھا۔لیڈی سر نواس دور کھڑی بڑی توجہ سے گھاسی چمار کا جادو دیکھ رہی تھیں۔

''او لنگڑے بھوت، کسنو تیلی کے سپوت، اپنی لنگوٹی لے اور بھاگ یہاں سے، نہیں تو چبا جاؤں گا تیرے جن بچے کچے۔ جے کالی مہا کالی کلکتہ والی کی جے۔کالی مہا کالی کلکتہ والی کے چھو چھو چھو...'' اور یہ منتر پڑھ کر اس نے جیسے ہی پھر مرچ کے دانے آگ پر مارے، ونو

ونود نے پیچھے سے اس کی گردن تھام لی۔

''ارے، ارے، سامنے سے اتر کر مجھ پر سوار ہو رہا ہے۔ ابے بھاگ نہیں تو بھسم کردوں گا۔ او... او... جبر جست کی بلا دور۔ بھاگ چمبور۔ اچھا چھوڑ میرا گلا۔ کھلاؤں گا لڈو موتی چور... نہیں چھوڑتا ... او کلوا تیلی... لے گڑ کی بھیلی اور بھگا اس سانڈے بھوت کو جو میری گردن ناپ رہا ہے۔''

وہ گھبرا گھبرا کر بڑبڑاتا گیا اور پریما اور راہل کے قہقہے نہ رک سکے۔ انھوں نے سوشیل کے بازو چھوڑ دیے۔

''ارے مہاراج، آپ؟'' گھاسی نے پلٹ کر ونود کو دیکھ کر کہا۔

''ہاں میں، دو چار بھوتوں کا باپ ہو۔ بول، ہو جاؤں سوار تیرے سر پر؟''

''ارے نہیں سرکار۔ آپ تو مائی باپ ہیں۔''

''چل بھاگ یہاں سے۔ جادوگر بنا ہے کمبخت۔''

ونود نے اسے گردن سے تھام کر پھینک دیا۔ اور وہ ایسا بھاگا کہ پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔

''یہ آپ لوگوں نے کیا گت بنوائی ہے ان کی؟'' ونود نے لیڈی سری نواس سے کہا۔ سوشیل گم سم سی اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے شاید اتنا غصہ تھا کہ وہ کسی سے بولی نہ تھی۔

''کیا کریں، بیٹا، ہمارے دماغ پریشان ہیں، کچھ نہیں سوجھتا ہے۔''

''ایسی کیا بات ہے۔ ہو سکتا ہے تبدیلی آب وہوا سے دماغ پر کچھ اثر ہو گیا ہو، ٹھیک ہو جائیں گی۔''

سوشیل خاموشی سے اٹھی اور باہر نکل گئی۔ پریما اور راہل نے آ کر ونود کو گھیر لیا۔

''آپ کیا کر رہی تھیں؟''

''ہم لوگ دیدی کا بھوت بھگا رہے تھے۔'' پریما نے ہنس کر کہا۔

''یہ ہنسنے کی بات ہے، پریما؟'' ماں نے اسے گھورا۔

''آپ کو بھی وہم ہے ممی۔ ونود بابو کا خیال صحیح ہے۔ دیدی پر کسی بھوت ووت کا سایہ نہیں ہے۔'' پریما نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

اسی وقت سرسری نواس اندر آ گئے۔

''میں کہتا ہوں تو مجھے کہا جاتا ہے کہ میں نئے وچاروں کا آدمی ہوں، میں دھرم کرم کیا جانوں۔'' انھوں نے آتے ہی کہا۔

''خدا نہ کرے انھیں کوئی ایسی بیماری بھی نہیں ہے۔ پھر کیوں ایسا سوچا جائے۔'' ونود نے کہا۔

''نہیں بھئی، یہ واقعات تو کچھ عجیب سے ہی ہیں۔ کل میں نے خود اس پاگل کو ایک عجیب سی بات سوشیل کو مخاطب ہو کر کہتے سنا ہے۔ میں تو یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ کل یہاں سے روانہ ہو جاؤں۔'' سرسری نواس نے کہا۔

''تو کیا وہاں جا کر ان کی طبیعت سنبھل جائے گی؟''

''خیر، وہ تو ہوتا نظر نہیں آتا۔ مجھے تو سوشیل کی بدنصیبی پر رونا آتا ہے۔ خدا جانے اسے ہوا کیا ہے؟ ورنہ اس جیسی لڑکی تو ملنا مشکل ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ وہیں بیٹھ گئے، پھر انھوں نے پریما سے فرمائش کی کہ وہ چائے بنا کر اس کے لیے لائے اور راہل سے کہا کہ وہ جا کر دیکھے سوشیل کی کر رہی ہے۔

ان دونوں کے جاتے ہی وہ ونود کو گھورنے لگے۔ ونود گھبرا گیا۔ وہ مسکرا دیے۔

''ڈاکٹر نے سوشیل کا صرف ایک علاج بتایا ہے کہ کہیں جلد از جلد اس کی شادی کر دی جائے اور یہ میں تم سے کہہ چکا ہوں۔''

''جی ہاں۔'' ونود نے سر جھکا لیا۔

''میرا خیال ہے کہ میں نے چند دنوں میں تمھیں اس قدر جان لیا ہے کہ جتنا برسوں

میں نہ جان سکتا۔''

ان کے اس جملے پر ونود چونکا ضرور، لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔

''تم نے کوئی موزوں لڑکا ڈھونڈا سوشیل کے لیے؟'' انھوں نے بڑی اپنائیت کے لہجے میں کہا۔

''جی، جی ہاں۔'' ونود نے سر ہلا دیا۔

''تو پھر کیوں نہیں بتاتے؟''

''جی... میں خود کو پیش کرتا ہوں۔'' بڑی جرأت سے اس نے کہہ ہی ڈالا۔

سرسری نواس اور ان کی مسز کے چہرے پر اس جواب سے سرخی آ گئی۔ سرسری نواس اٹھ کھڑے ہوئے اور تعظیماً ونود بھی۔ اور انھوں نے اسے گلے لگا لیا۔

''تم نے میرے سینے سے آج ایک بہت بڑا غم کا بوجھ ہٹا لیا ہے، ونود۔ سچ پوچھو تو میں نے خود تمھیں پسند کیا تھا، ان میں سے کسی کے لیے۔'' انھوں نے اس کی پیٹھ تھپک کر کہا۔

''اس عزت افزائی کے لیے شکریہ ادا کرتا ہوں۔'' ونود سر جھکا کر بولا۔

''نہیں، بیٹے، اچھے لوگ تقدیر والوں کو ہی ملا کرتے ہیں۔'' سرسری نواس نے کہا۔

''لیکن مجھے بھی کچھ عرض کرنا ہے۔''

''کہو، شوق سے کہو۔''

''یہ شادی جلد از جلد کر دی جائے۔''

''لو، یہ تو تم نے میرے ہی منہ کی بات چھین لی۔ ارے بھئی، میں تو مہورت وغیرہ کا قائل ہی نہیں ہوں۔ میری طرف سے تو تم آج ہی کر لو۔''

''آج تو نہیں، لیکن کل ہو سکتا ہے۔''

''کسی خاص تیاری کی بھی ضرورت نہیں۔ تم جیسا چاہو، ویسا کر ڈالو۔ یہاں کے لوگوں کو دعوت دینے کے لیے تو غالباً کارڈز کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔''

Akram Allahabadi

''وہ انتظام میں خود کرلوں گا۔''

یہ کہہ کر وہ اجازت طلب انداز میں اٹھ کھڑا ہوا اور آج اتنے دنوں میں پہلی بار اسنے اس جوڑے کے چہرے خوشی سے کھلے ہوئے محسوس کیے۔ شاید وہ سوشیل کے خیال سے ہی اداس ہو جایا کرتے تھے۔

لیکن جس وقت وہ اپنے بنگلے پر پہنچ کر اپنے کمرے میں داخل ہوا تو حیران رہ گیا۔ یہاں اسے پریما بیٹھی نظر آئی۔ وہ اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی، لیکن ونود سے اس کی آنکھوں میں لرزتے ہوئے آنسو چھپے نہ رہ سکے۔ اس نے ایک بار اس سے نظریں ملائیں اور سر جھکا لیا۔ پریما خود ہی اس کے قریب آ گئی۔ یہاں اس وقت تقریباً کئی فرلانگ تک سناٹا تھا۔ ونود کا نوکر بھی اس وقت موجود نہ تھا۔ عجیب رومانی لمحات تھے، جن میں جذبات کی شدت اس وقت علیحدہ علیحدہ پہلو اختیار کیے ہوئے تھی۔

''میں سب سن چکی ہوں۔'' اس نے قریب پہنچ کر روندھے ہوئے گلے سے کہا۔

''پپ... پریما...'' ونود نے کہنا چاہا، مگر کہہ نہ سکا۔

''میں پوچھتی ہوں اس طرح میری زندگی سے کھیلنے کا آپ کو کیا حق تھا؟''

''مجھے غلط نہ سمجھو، پریما۔''

''غلط نہ سمجھوں؟ کیا غلط نہ سمجھوں؟ آج کی بات یا آپ کی ملاقاتیں؟''

''میں نے کبھی کوئی قدم ایسا نہیں اٹھایا جس سے تم ایسا سمجھ سکتیں۔''

''اوہ، تو یہ میری غلط فہمی تھی، جس کی خاطر میں نے اپنی زندگی کی خوشیاں تباہ کرلیں۔'' یہ کہہ کر وہ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر رو پڑی۔

پھر وہی بات۔'' ونود سے نہ رہا گیا۔ اس نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

''میں نے تو آپ کو اپنے من مندر کا دیوتا بنایا تھا۔ میں نے تو آپ کی پوجا کی تھی۔ پھر میری پوجا بے اثر کیوں نکلی؟ میرے دیوتا نے کیوں مجھ سے آنکھیں پھیر لیں؟'' وہ سسکیوں

میں کہتی رہی۔

''پریما۔''ونود کا لہجی بھی رقت انگیز ہوگیا۔

''کیا زبان سے کہہ کر ہی محبت کا اظہار کیا جاتا ہے؟ کیا میری خاموش نگاہوں نے آپ سے سب کچھ نہ کہہ دیا تھا؟ کیا آپ نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ ایک وقت آپ نہیں آتے تو میں کیوں بے چین ہوکر یہیں آپہنچتی ہوں؟ پھر آپ پتھر کیوں بن گئے؟ بولیے... بولیے نا۔ آپ نے پہلی ہی بار مجھے کیوں نہ دھتکار دیا۔ آپ نے کہہ کیوں نہ دیا کہ پریما، تم میرے لائق نہیں ہو۔ میں تم سے نفرت کرتا ہوں۔ میں تمہیں اپنے قریب نہیں دیکھنا چاہتا۔''

''مگر میں نے یہ کب کہا ہے کہ میں تم سے نفرت کرتا ہوں؟ میں تمہیں اپنے قریب نہیں دیکھنا چاہتا؟''

''مگر میں نے یہ کب کہا ہے کہ میں تم سے نفرت کرتا ہوں۔''ونود نے یہ کہہ کر اس کے دونوں ہاتھ طاقت سے اس کے چہرے سے ہٹا لیے۔ وہ آنسوؤں سے تر تھے۔

''کاش، میں پہلے ہی یہ سب کچھ جانتی ہوتی۔ اب تو میں کبھی یہ نہ بھول سکوں گی کہ میں نے آپ سے محبت کی تھی۔''یہ کہہ کر اس نے ہاتھ چھڑائے اور دروازے کی طرف بھاگی۔

لیکن ونود نے اس کا راستہ روک لیا۔

''سنو۔''

''اب کیا رہ گیا ہے سننے کو۔''

''تمہیں سننا ہوگا۔''اس نے اس کے بازو تھام لیے۔''تمہیں یہ سننا ہوگا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں، لیکن شادی سوشیل سے کر رہا ہوں۔''یہ کہتے ہوئے ونود کے چہرے پر ایک ایسی سرخی دوڑ گئی جسے انتہائے ضبط کی کیفیت بھی کہا جا سکتا تھا، یا شدتِ جذبات کی انتہا۔ وہ جیسے بپھر گیا تھا۔ اور پریما اپنے آنسوؤں کو بھول کر حیرت سے اس کی صورت دیکھنے لگی۔

''اور جانتی ہو کیوں میں سوشیل سے شادی کر رہا ہوں؟ اس لیے کہ تمہارے ماں

باپ کی مایوسی انتہا کو پہنچی ہے۔اس لیے کہ اسی طرح سوشیل کی زندگی کو تباہی سے بچایا جا سکتا ہے اور اس لیے کہ تمہارے خواہستگار ہزار مل جائیں گے، لیکن اس کی زندگی کے اندھیرے دور کرنے کوئی نہیں آئے گا۔ پریما، میں جانتا ہوں کہ یہ فیصلہ کر کے مجھے اپنے آپ پر کس قدر ظلم کرنا پڑا ہے۔تمہیں پاتے ہوئے مجھے جس قدر مسرت ہوئی تھی، تمہیں کھوتے ہوئے مجھے اس سے کہیں زیادہ سوہانِ روح اذیت سے گزرنا پڑا ہے۔پریما، تم مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہو، لیکن میں ایک زندگی کو تباہ ہونے سے بچانے کے لیے اپنے جذبات کی قربانی دینا چاہتا ہوں۔تمہارے ڈیڈی نے بڑے ارمانوں اور بڑی امید سے میرے سامنے ایک سوال پیش کیا تھا اور مجھ سے یہ خودغرضانہ جرأت نہ ہوئی کہ ان کی امید کو خاک میں ملا کر میں سوشیل کی بجائے ان سے تمہیں مانگ لوں۔کیا مجھے وہ عام آدمیوں کی طرح سطحی اور خودغرض نہ سمجھتے؟ بتاؤ، پریما؟ میرے لیے اس کے سوا کیا راستہ تھا کہ یا تو دونوں کو کھودوں یا سوشیل کو پا کر کم از کم تمہیں اپنی آنکھوں کے سامنے تو رکھ سکوں۔''

وہ کہتا ہی گیا اور پریما بت بنی سنتی رہی۔اس کی کھلی آنکھیں ڈبڈبائیں اور آنسوؤں کی دھار رخسار تک بہنے لگی۔اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی، بلکہ اپنا سر ونود کی چوڑی چھاتی پر ٹیک دیا۔

''پھر میں کیا کروں؟'' اس نے سسکی لے کر کہا۔

''کچھ دیر بعد تم محسوس کروگی کہ قربانی دینے میں جو روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے، وہ حاصل کر لینے میں نہیں۔'' اس نے اس کی ٹھوڑی اوپر کر کے کہا۔

اور پھر آنسوؤں کی دھار ڈھلک پڑی اس کے رخسار پر۔ونود بے قابو ہو گیا۔اس نے شدّتِ جذبات سے اس کو سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔وہ اسی عالم میں بڑی دیر تک رہے۔ وقت گزرتا رہا اور ان کے دل ایک ساتھ دھڑکتے رہے۔ان کی سانسیں ٹکراتی رہیں اور آنکھیں بند رہیں۔پھر رفتہ رفتہ ان کی کیفیت اعتدال پر آ گئی۔ان کے بازوؤں کی گرفت ڈھیلی پڑتی گئی

اور پریما کی نظریں جھک گئیں۔بچوں جیسی شوخ وشنگ پریما اس وقت بڑی باوقار سنجیدہ نظر آرہی تھی۔

''آپ نے ٹھیک ہی فیصلہ کیا ہے۔''اس نے روندھے ہوئے گلے سے کہا اور باہر جانے لگی۔

''پریما۔''ونود نے پیچھے سے آواز دی۔وہ پھر رک گئی اور پلٹ کر دیکھنے لگی۔

''تم...تم پوجنے کے لائق ہو،پریما۔''وہ اتنا ہی کہہ سکا۔

اور پریما باہر نکل گئی۔ونود سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔اس نے جو فیصلہ کیا تھا،وہ خود اس کے اپنے جذبات کا ماتم تھا،لیکن نہ جانے کیوں وہ سرسری نواس اور ان کی مسز کی مسلسل اداسی برداشت نہیں کر سکا تھا۔وہ سمجھ رہا تھا کہ ہل اسٹیشن پر تبدیلی آب وہوا اور تفریح کے لیے آنے والا یہ جوڑا کسی تفریح میں دلچسپی کیوں نہیں لے رہا ہے،بجھا بجھا کیوں رہتا ہے۔اس نے سوچ سمجھ کر ہی یہ قدم اٹھایا تھا اور اس کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا تھا۔اس بوڑھے جوڑے کی اداسیاں اچانک مسرت میں بدل گئی تھیں۔ان کے چہرے کھل اٹھے تھے۔

☆☆☆☆☆☆

Akram Allahabadi

آخری نغمہ

اس شام کو غروبِ آفتاب سے پہلے سرسری نواس نے سوشیل کو اپنے پاس ہی بٹھالیا اور ریڈیو کی آواز تیز کردی۔ وہ اس سے ادھر ادھر کی باتیں بھی کرتے رہے اور انھوں نے اندازہ لگایا کہ اسے اس طرح مصروف رکھنے سے اس پر کسی پاگل پن کا دورہ نہیں پڑا۔ وہ اسے پاگل پن ہی سمجھتے تھے۔ کسی آسیب کے وہ سرے سے ہی قائل نہ تھے، مگر پاگل اپدیش کی باتوں سے انھیں جو شبہ ہوا تھا، وہ ونود کی باتوں اور ٹرنک کال پر فیملی ڈاکٹر کے مشوروں سے دور ہوگیا تھا۔ یہ تجویز بھی ان کے فیملی ڈاکٹر نے آج ہی ٹرنک کال پر بتائی تھی کہ اسے مصروف رکھنے کی کوشش کی جائے، یا پھر واپس لے آیے۔

رات کو بھی سوشیل کو انھوں نے اپنے کمرے میں ہی سلایا اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق گہری نیند کی گولیاں دے دیں۔ یہ خواب آور گولیاں وہ خود بھی استعمال کیا کرتے تھے، کیونکہ ایک زمانے میں انھیں انسومنیا کی بیماری ہوگئی تھی۔

بہر صورت سرسری نواس، سرسری نواس ہی تھے۔ ہل اسٹیشن پر انھوں نے ٹرنک کال سے ہی وہ انتظام کر ڈالا جو شہر میں رہ کر کر سکتے۔ صبح کی گاڑی سے اچانک شہر سے ان کے بہت سے خاص رشتے دار آپہنچے۔ کچھ معزز مہمان بھی آگئے، جن کا ان سے قریبی تعلق تھا اور دوپہر تک اور بھی مہمان کاروں سے آپہنچے۔ دو ٹرک سامان بھر کر آئے اور شہر سے ان کے چند ملازم اور بھی آگئے۔ ونود کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ کیا ہو رہا ہے اور یہاں شانتی کنج کو دلہن کی طرح سجا دیا گیا۔ ونود نے اسٹیٹ کے رہائش گاہوں میں ٹھہرے ہوئے لوگوں کو خود دعوت دے دی تھی اور کوئی خاص رشتے دار بھی اس کے نہ تھے، سوائے اس کی ماں کے۔ اور رانی صاحبہ بھی اس کی ماں کو لے کر دوپہر تک کار سے پہنچ گئیں۔ اس وقت ہی ونود کو اس اہتمام کا علم ہوا۔ سرسری

نواس نے کچھ نہ کرتے ہوئے بھی بہت کچھ کر ڈالا تھا۔ دوپہر کے وقت راہل اس کے پاس آیا۔ وہ ایک خط ساتھ میں لایا تھا، جو سوشیل کا تھا۔ اس میں اس نے صرف اس قدر لکھا تھا:

''کیا آپ کو اس سے خوشی ہوگی؟''

ونود نے بھی جواب بہت مختصر دیا:

''بہت۔''

صرف یہی لکھ کر اس نے راہل کو دے دیا۔

شام ہونے سے پہلے سوشیل کو دلہن بنا دیا گیا، لیکن اس کے چہرے پر نہ خوشی کے آثار تھے، نہ غم کے۔ اپنی عادت کے مطابق آج بھی وہ چپ چاپ تھی۔ البتہ خود ہی لیٹے لیٹے مسکرا دیتی، لیکن یہ مسکراہٹ بھی کچھ عجیب سی ہوتی۔ جیسے کوئی اپنی محرومی پر خود ہی ہنس دے۔ لیکن پریما ضبط کی کوشش کے باوجود اپنی اداسی کو نہ چھپا سکی تھی۔ اس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے اور آنکھیں بے نور سی نظر آ رہی تھیں۔ عام طور پر لوگوں نے اسے تھکن کی علامت سمجھا۔

سرسری نواس کی بہن کے شہر سے آنے میں زیادہ دیر ہوگئی، جس کی وجہ سے شام ہوگئی۔ شہنائیوں کی آواز میں شانتی کنج کا شور دب کر رہ گیا تھا۔ یہ شہنائی والے بھی عجیب تھے۔ وہ بستی سے آئے تھے اور انھیں مکھیا نے بھیجا تھا، لیکن سرسری نواس کو زیادہ شور و شغب پسند نہ تھا۔ انھوں نے انھیں بجانے کو منع بھی کیا، مگر وہ نہ مانے۔ وہ شہنائی بجاتے ہی چلے جا رہے تھے۔ دینو جا کر مکھیا اور بستی کے کچھ لوگوں کو بھی ونود کی طرف سے دعوت دے آیا تھا اور وہ لوگ بھی اپنے مخصوص قبائلی لباسوں میں تحائف لے کر آ پہنچے تھے۔ شہر سے آئی ہوئی رشتے دار عورتوں نے سوشیل کو گھیر رکھا تھا۔ ان کی چیاؤں چیاؤں اور باہر شہنائی کی آواز نے اس کے سر میں درد کر دیا تھا۔ وہ اب بھی گم سم اور سنجیدہ تھی۔ نہ تو کسی کے چھیڑنے پر ہنستی تھی، نہ اسے کوئی ملال تھا۔

مغرب سے کچھ پہلے ہی ونود اپنی ماں، رانی صاحبہ اور اپنے چند مقامی دوستوں کے ساتھ آ پہنچا۔ تمام مہمان عورتیں دولہا کو دیکھنے کے لیے دلہن کو چھوڑ دروازے کی طرف دوڑ

پڑیں۔کچھ دیر کے لیے شہنائی والے بھی چپ ہو گئے، بے چارے تھک گئے تھے، لیکن باہر شور ہی اس قدر تھا کہ شہنائی کی آواز کی طرف کوئی توجہ نہ کرتا تھا۔

پنڈت کے آجانے کے بعد سرسری نواس سے کہا گیا کہ وہ کنیا کو لے کر آئیں۔اور وہ خوشی خوشی دوڑے اندر چلے گئے۔

لیکن جب دیر ہوئی اور وہ نہ لوٹے تو خود پریما انھیں بلانے گئی۔مگر کچھ دیر بعد اندر سے اس کی چیخ ہی سنائی دی۔لیڈی سری نواس بھاگ کر پہنچیں تو انھیں سوشیل تو کہیں نظر نہ آئی، البتہ سرسری نواس بے ہوش ہوئے پڑے تھے اور پریما انھیں ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔ونود بھی خبر پا کر آپہنچا۔

سرسری نواس کو ہوش میں لے آیا گیا۔وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ونود کی طرف دیکھنے لگے اور جب ونود نے انھیں سہارا دے کر اٹھایا اور سوشیل کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے صرف پشت کی کھڑکی کی طرف اشارہ کر دیا۔ونود نے دیکھا کھڑکی کے ایک پٹ کی سٹکنی کی نوک سے ایک ساڑھی کا پلّو کا ذرا سا کونا لٹکا ہوا تھا، جیسے کوئی کھڑکی سے اتر کر تیزی سے بھاگا ہو اور اس کی ساڑھی کو کونہ اس میں الجھ کر پھٹ کر رہ گیا ہو۔

''میں نے ...میں نے بھی اس بانسری کی مدھم آواز یہاں آ کر سنی تھی، جیسے دور کسی پہاڑ پر کوئی بانسری بجا رہا ہو۔''سرسری نواس نے بتایا۔

''خدا جانے کس طرف گئی ہوں گی۔''ونود نے پریشان لہجے میں کہا۔

''میں جانتا ہوں کہاں گئی ہوں گی دیدی۔''پیچھے سے راہل کی آواز آئی۔

''تو چلو۔''

آگے آگے راہل، پیچھے ونود اور پریما دوڑ پڑے۔سرسری نواس نے جانا چاہا تو ونود نے انھیں روک دیا کہ آپ یہیں ٹھہریے، ہم انھیں لے کر آتے ہیں۔

ان لوگوں کو کسی طرف پریشان سا جاتا دیکھ کر ان کے نوکر بھی پیچھے ہو لیے۔بستی کا

سردار بھی ان کے پیچھے چل پڑا۔

☆☆☆☆☆☆

بانسری کی آواز جیسے سوشیل کے سینے سے دل کھینچ کر نکالے لے رہی تھی۔ وہ بے تحاشا دوڑ رہی تھی اور میگھ دوت کی پہاڑی اسی پراسرار سریلی پر کشش آواز سے گونج رہی تھی، جیسی پوری پہاڑی کی فضا اسی آواز سے لبریز ہو اور پھر وہ بادلوں کے دیش میں پہنچ گئی۔ میگھ دوت کی پہاڑی آج پھر کوئی داستان کہنے والی تھی، آوارہ ہواؤں سے خاموش فضاؤں سے۔

''یوجنا...'' اس کی چیخ پہاڑوں پر گونجی، جسے سنتے ہی نیچے سے اوپر کی طرف آنے والے ونود، راہل اور پریما اور تیز قدم اٹھانے لگے۔

''یوجنا...'' وہ بادلوں کے کہر میں داخل ہوتے ہی چیخی۔ اور بانسری کی گونج اور تیز ہو گئی۔ ''یوجنا... آج میں دلہن بن کر آئی ہوں۔ دیکھو... سامنے آؤ یوجنا...'' وہ چیختی جاتی اور ہر میں ڈوبتی دوڑتی جاتی، یہاں تک کہ اسے یوجنا کا سفید سایہ مندر کی سیڑھیوں سے اتر کر اپنی طرف آتا نظر آیا۔ پھر وہ کچھ فاصلے پر رک گیا۔ سوشیل اس کی طرف بڑھی تو وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹا۔ بانسری اس کے لبوں سے ہٹتے ہی فضا میں ساکت ہو گئی، حتا کہ درختوں کے پتے بھی کھڑ کھڑانا بھول گئے۔

''میں آ گئی ہوں، یوجنا۔ میں جانتی ہوں تم میرے انتظار میں بیس سال سے یہاں بھٹک رہے ہو۔ یوجنا... جس نے تمہیں اس جنم میں پانے کے لیے اسی دن دوسرا جنم لے لیا تھا، جس دن ہم سے ہماری زندگیاں چھین لی گئی تھیں، لیکن تم میرے انتظار میں یہیں بھٹکتے رہ گئے۔''

وہ کہتی رہی اور آگے بڑھتی رہی۔

یوجنا کی روح پیچھے ہٹتی چلی گئی، یہاں تک کہ وہ شکستہ مندر کی سیڑھیوں پر چڑھنے

لگی۔ یہ مندر کے تاریک شکستہ حصے میں داخل ہوگئی۔ بادلوں کی کہر سے میگھ دوت کی دلہن کا لباس نم ہوگیا تھا۔ وہ بھی دونوں ہاتھ پھیلائے اس کی طرف بڑھتے بڑھتے مندر میں داخل ہوگئی۔

مندر کی پشت کی دیوار ٹوٹی ہوئی تھی اور اس کے پیچھے نیچے کئی سو فٹ گہری گھاٹی تھی۔

یوجنا کی روح پشت کی دیوار کے نزدیک پہنچ کر تھم گئی۔

''اب تم اکیلے نہیں جاؤ گے، یوجنا۔''

یہ کہہ کر وہ اس پر اس طرح جھکی کہ شکستہ دیوار کے خلاء سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆☆☆☆

وہ جس وقت اس کی آواز کا تعاقب کرتے ہوئے مندر کے راستے پر پہنچے تو انھوں نے دور سے ہی اس کا سایہ مندر میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔

''دیدی...دیدی...'' دور سے ہی پریما اور راہل ایک ساتھ چیخ کر دوڑے، لیکن جب وہ اس کہر کو عبور کر کے مندر کے نزدیک پہنچے تو یہاں بھیانک سناٹا ہر طرف مسلط تھا اور درختوں کے پتے تک ساکت تھے۔

''میں نے نیچے سے ہی دیدی کو اس مندر کی سیڑھیاں چڑھتے دیکھا تھا۔'' راہل نے گھبرا کر کہا۔

اس پر تینوں شکستہ مندر میں گھس گئے۔

''دیدی...'' پریما بڑے زور سے چیخی۔ اور جب راہل اور ونود نے بھی شکستہ دیوار کے شگاف سے جھانک کر نیچے دیکھا تو...

آج کی دلہن کی لاش خون میں لتھڑی نیچے ایک چٹان پر پڑی تھی۔

اچانک دل دہلانے والی بانسری کی لے نے انھیں پہاڑ کے چپے چپے پر گونجتی سنائی

دی اور تیزی سے دور ہوتی گئی، مدھم پڑتی گئی..اور مدھم پڑتی گئی...اور مدھم پڑتی گئی... یہاں تک کہ میگھ دوت کی پہاڑی پر موت کا پرہول سناٹا چھا گیا اور بادلوں کے سائے سفید سفید فرشتوں کی طرح پہاڑی پر منڈلاتے نظر آنے لگے۔ پریما یہ منظر برداشت نہ کر سکی اور رونود سے لپٹ گئی۔

اسی وقت انھیں ایک آواز نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ نیچے نشیب کی پگڈنڈی سے پاگل اپدیش اپنے گدھے پر بیٹھا گاتا گزر رہا تھا۔

وہ گا رہا تھا:

آج ان دو بے قرار روحوں کا اتم ملاپ ہو گیا جنھیں ایک بے رحم انسان کے غرور نے ایک بار جدا کر کے ان کے درمیان جنم جنم کے فاصلے پھیلا دیے تھے۔

وہ آج مل گئے ہمیشہ کے لیے
میرا یوجنا..اور تیری راج کماری
اور راجا نگم
اب نزک کی آگ میں تڑپ اور ہاتھ مل
قدرت محبت کرنے والوں کے ساتھ ہے
چاہے وہ اس جنم میں ملیں
چاہے دوسرے جنم میں
دلوں کو کوئی جدا نہیں کر سکتا
روحیں کبھی جدا نہیں ہوتیں
صرف جسم جدا ہوتے ہیں
چل میرے گدھے
آج تو بھی گا کہ آج میں بہت خوش ہوں

Akram Allahabadi

ایک باپ کے بیٹے کی بے چین روح
ہمیشہ کے لیے چین پا گئی ہے
گا
میرے پیارے گدھے
آج موسمِ بہار کے نغمے گا
کیونکہ اب یوجنا کی بانسری کبھی نہیں بجے گی
یہ پہاڑ ہمیشہ کے لیے اب ویران ہو گئے
اور وہ اپنی منزل کی طرف گئے
جہاں ابدیت ان کا استقبال کرے گی
چل میرے پیارے گدھے
آج ہم جو کی روٹی کھائیں گے

☆☆☆☆☆☆

اور پھر وہ بھی اتنی دور نکل گیا کہ اس کی آواز ہوا کی سرسراہٹ میں بھی سنی نہ جا سکی۔

☆☆☆☆☆☆

دوسرے دن جب ونود نے دفتر سے ریکارڈ نکال کر دیکھا تو واقعی راج کماری کی موت کی وہی تاریخ تھی، جو سوشیل کی پیدائش کی تھی۔

☆☆☆☆☆☆

اور دوسرے دن ہی اپنی ایک عزیز ترین اولاد کو کھو کر سرسری نواس اور لیڈی سری

Akram Allahabadi

نواس اپنے بیٹے، بیٹی اور داماد کے ساتھ ہمیشہ کے لیے اس ہل اسٹیشن سے روانہ ہو گئے۔ انھوں نے عہد کر لیا تھا کہ اب کبھی وہ یہاں نہیں آئیں گے، لیکن انھیں کیا معلوم تھا کہ ایک روح نے اپنے بچھڑے ساتھی سے ملنے کے لیے ان کے گھر میں بیس سال پہلے جنم لیا تھا اور کل وہ اس کے ساتھ چلی گئی تھی جس کا وہ انتظار کر رہی تھی۔

☆☆☆ ختم شد ☆☆☆

Akram Allahabadi